انصار احمد شیخ
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبۂ اردو، جامعہ کراچی

فحاشی اور عریانی کے تصورات، اردو ادب کے تناظر میں

ABSTRACT

Imagination of Obescenity and Nakedness in Urdu literature
By Ansaar Ahmed Shaikh, Asst. Prof., Department of Urdu, University of Karachi.

Erotica and Obsentity are two separate terms which are mistakenly used for each other. The sexual desire, unusual boldness, unreluctant expression and uncovered expressions in writing are considered as Obsentity (Nakedness) while if from the begining to the end an erotic motviation towards lust and sexual desire is reflected then it is termed as erotica writing. The perceptions towards erotica writings and nakedness kept on changing in each culture in accordance with the time. Probably no literature in the world is free from it. In our Urdu prose and poetry the same is also reflected. In the current article, a brief review and cticism has been made in the same perspective.

اردو ادب میں ''فحاشی'' اور ''عریانی'' دو علاحدہ اصطلاحات ہیں۔ جو عام طور پر مترادف کے طور پر مستعمل ہیں۔ ادب میں فحاشی اور عریانی کے جائزے سے قبل پہلے ہم ''فحاشی'' اور ''عریانی'' کے مفہوم کو مختصراً سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادب کی اصطلاح میں ''فحاشی'' کی اب تک کوئی ایسی جامع و مانع تعریف متعین نہیں کی جاسکی ہے کہ جس پر مشرق اور مغرب نے بِلا چون و چرا کامل اتّفاق کرلیا ہو۔ ہر ملک اور ہر دور کے ماہرینِ فن نے فحاشی کی اپنی الگ اور مختلف تعریف کی ہے۔ دراصل اس کی وجہ یہی ہے کہ فحاشی ایک ایسا اضافی تصوّر ہے، جس کا مختلف عہد اور مختلف سماج میں مختلف مفہوم رہا ہے۔ ایک عہد میں جو بات قابلِ گرفت یا فحش سمجھی جاتی ہے، وہ دوسرے عہد میں ہرگز فحش نہیں سمجھی جاسکتی۔ بالکل اسی طرح ایک دور میں جو عام اور معمولی بات ہوتی ہے، وہ دوسرے دور میں فحش تصوّر کی جاتی ہے۔ مثلاً ہمارے کلاسیکی ادب میں ایسی تخلیقات بھی ملتی ہیں، جو اپنے عہد میں نہایت مقبول و معروف تھیں اور جن پر علم بردارانِ اخلاق کو کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ ادبی دنیا میں ایسی تخلیقات کی فنّی قدر و منزلت اپنی جگہ مسلّم ہے، لیکن آج کے اخلاقی نقطۂ نظر سے وہ تخلیقات فحش تصوّر کی

جاسکتی ہیں۔ جب کہ اُس دور میں انھیں مخرّب الاخلاق کے زُمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا تھا، کیوں کہ اُس عہد میں اخلاقی قدروں کا معیار وتصوّر آج سے قدرے مختلف تھا۔(۱)

ادب میں ''فحاشی'' سے متعلق جو مختلف آرا ملتی ہیں۔ معمولی اختلاف رکھنے کے باوجود فحاشی کے مطلب ومفہوم کو سمجھنے میں کچھ نہ کچھ مدد ومعاون ثابت ہوسکتی ہیں۔ اس ضمن میں اردو جامع انسائیکلو پیڈیا میں فحاشی کے مفہوم کی وضاحت کچھ یوں ملتی ہے:

> ''لغوی اعتبار سے یہ لفظ بدکاری اور بے حیائی کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے..... نفسیات کو اُکسانے والے تمام افعال یعنی لچر اور بیہودہ قسم کی فلمیں، برہنہ تصاویر اور مجسّمے، جنسی ڈرامے، ناچ اور شراب وغیرہ بھی عریانی اور فحاشی میں شامل ہیں۔'' (۲)

نیاز فتح پوری نے تو اِس حوالے سے ''ترغیباتِ جنسی یا شہوانیات'' کے عنوان سے ایک پوری کتاب لکھ ڈالی ہے۔ اُس میں فحاشی کی تعریف اس طرح درج ہے:

> ''فحاشی نام ہے، ہر اس طریقِ عمل کا جو قانونِ قدرت یا سوسائٹی کے مقرّر کردہ اصول کے خلاف خواہشِ نفسانی کو پورا کرنے کے لیے اختیار کیا جائے اور اس میں وہ صورت بھی شامل ہے، جس کا تعلّق صرف کسبِ زر سے ہے اور جس کو عصمت فروشی کہہ سکتے ہیں۔'' (۳)

اِسی طرح مختلف اردو لغات میں ''فحاشی'' کے معنی: بدکرداری، بدکاری، بے حیائی، عریانی اور شرارت وغیرہ کے بھی ملتے ہیں۔(۴) علاوہ ازیں اس فحاشی میں ایذا کوشی، ایذا طلبی، گالی، سادیت پسندی، استلذاذ بالمثل، استلذاذ بالنفس، استلذاذ بالخیال اور بچّوں وجانوروں کے ساتھ بدفعلی وغیرہ شامل ہیں۔ دراصل فحاشی کے مفہوم میں ناقدینِ ادب اور قاری کو جنسی اذکار میں لذّتیت کے اظہار کے ساتھ ترغیب کا عنصر بھی دیکھنا چاہیے۔ ادب اور فنونِ لطیفہ میں کہیں بھی ایسی ترغیب نظر آجائے جو ہمیں بے ساختہ شہوانی لذّتوں کے دائروں میں لے جائے، جس میں جذبات کو برانگیختہ کر کے جنسی چٹخارہ پیدا کرنے کی سعی کی گئی ہو تو ایسا ادب اور فنونِ لطیفہ قطعی طور پر فحش ہے۔

> ''تحریر وتقریر میں، شعر وشاعری میں، فحاشی تلاش کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کی ترغیب ٹٹولنی چاہیے، اگر یہ ترغیب موجود ہے، اگر اس کی نیت کا ایک شائبہ بھی نظر آرہا ہے تو وہ تقریر، وہ شعر، وہ بُت، قطعی طور پر فحش ہے۔''(۵)

ہم فحاشی کے مفہوم کو مختصراً اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ کسی بھی تخلیق میں انسانی جذبات واحساسات کو بھڑکانے کے لیے ایک تسلسل کے ساتھ ترغیبِ شہوانی کا ایسا مواد ہو، جو جذبات کی تسکین کے لیے وافر قسم کا سامان فراہم کر رہا ہو۔ جس

میں جنسی کیفیات کو بغیر کسی بِلا کسی جھجک، تامل، ہچکچاہٹ اور خدشے کے لذّتیت اور سرور وانبساط کے ساتھ محض مخصوص اعضا کو محض جذبات اُبھارنے اور مشتعل کرنے کے لیے بیان کیا جائے۔ ایسے عمل سے جذباتِ شہوانی اپنے عروج پر پہنچ کر کسی بھی معیوب یا شرم ناک عمل کے لیے مستعد ہو جائیں اور اس کے ساتھ ساتھ جنسی جذبے کی مدافعت اور روک تھام کی تمام کوششیں بے کار ثابت ہو جائیں، تو جذبات کو برانگیختہ کرنے کی ایسی شعوری کوششیں خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہوں، فحش نگاری کے زُمرے میں آئیں گی، لیکن یاد رہے کہ کوئی بھی ادبی فن پارہ جس میں جنس کا تذکرہ ہو، اور وہ اوّل و آخر موضوعاتی لحاظ سے جنسی جذبات واحساسات کو مفصّل ہی کیوں نہ پیش کر رہا ہو، اگر اُس میں ترغیب، شہوت پرستی، عیش کوشی اور جنسی تلذّذ کا پہلو نمایاں نہیں ہے، تو وہ کسی بھی صورت میں فحاشی کے دائرے میں نہیں آئے گا۔

فحاشی کے ضمن میں متذکرہ آرا کے علاوہ بھی ایسے خیالات وتصوّرات ملتے ہیں۔ جس میں جنسی معاملات و افعال کا لذّتیت کے ساتھ عریاں اظہار فحشیات کے زُمرے میں بتایا گیا ہے۔ جب کہ حسن عسکری جنسی فعل کو لذّت کے ساتھ بیان کرنے کو بھی جائز تصوّر کرتے ہیں۔(۶) فحاشیات یعنی شہوانی جذبات کی اشتعال انگیزی اگر تحریر وتقریر اور شعروادب میں دیکھی جاسکتی ہے، تو فلمیں، رقص وموسیقی، تصاویر، مخصوص اخبارات، رسائل، مجسّم سازی، اشتہارات وغیرہ میں اس کی کثرت سے شاید کسی کو انکار ہو۔ اسی طرح ہمارے یہاں اور مغرب میں ایسا بازاری لٹریچر عام دستیاب ہے۔ جس میں کوک شاستر کی طرح نت نئے انداز میں مختلف آسنوں کا تفصیلی تسلسل کے ساتھ ذکر ملتا ہے۔ یاد رہے کہ ایسا مواد ہرگز ہرگز ادب کے دائرے میں نہیں آتا ہے، کیوں کہ اِس نوع کے مواد میں ہمیشہ ایک جذبہ اور مقصد کارفرما رہتا ہے۔ اُسی جذبے اور مقصد کو سامنے رکھ کر اس کی تخلیق کی جاتی ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ انھی مقاصد کے تحت ایسی تخلیقات میں ہمیں صرف جنس برائے جنس ہی دکھائی دیتی ہے۔ جس میں جنس کو زیرِ بحث لا کر جنسی ہیجان بپا کیا جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ادب میں فحاشی کا تصوّر مفقود ہے۔ بے شک اردو ادب میں آغاز سے لے کر عہدِ حاضر تک جنس نگاری کے حوالے سے فحاشی کی متعدّد مثالیں موجود ہیں، لیکن ان سب میں کسی بھی صنف کے اندر اوّل و آخر ایک تواتر کے ساتھ جذبات کو بھڑکا دینے والا شہوت خیز انداز نہیں ملے گا۔ ادب ہمیشہ زندگی کا ترجمان رہا ہے، جب ہماری زندگی میں جنس کی کارفرمائی ہے، تو ادیب کیونکر اِس پہلو سے صرفِ نظر کرسکتا ہے، وہ زندگی کی ایک اہم حقیقت سے کیسے انکار کرسکتا ہے۔ ایک فن کار اپنے فن کے ذریعے جب سماجی زندگی کی جولانیوں کی عکس ریزی کرتا ہے، تو وہ اپنے مشاہدے اور تجربے کے بل بوتے پر اُس فن پارے کا فنی مواد بھی اپنے معاشرے ہی سے اخذ کرتا ہے۔ معاشرتی مسائل کی ترجمانی میں وہ منفی انسانی سرگرمیوں، جنسی معاملات، جنسی تعلّقات، جنسی بے راہ روی وغیرہ کو اُتنی ہی اہمیت دیتا ہے، جتنی کہ زندگی کے کسی بھی اہم مسئلے کے بیان کو اُجالنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اس ضمن میں وہ اپنے اظہارِ فن کو مؤثّر بنانے کے لیے کہیں پوشیدہ اور ڈھکے چھپے انداز میں تو کہیں واضح اور کُھلے ڈھلے انداز سے انسانی جذبات واحساسات اور اور اعضا کے اذکار کو نمایاں کرنے

کے لیے رومانیت، نیم یا کُھلی عریانیت و فحاشی کا سہارا بھی لے لیتا ہے۔

اس وضاحت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی ادیب نے اگر سماجی زندگی سے جنسی اور شکمی بھوک کو اعتدال سے تجاوز کرتے ہوئے غیر صحت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے اور اس پیش کش میں معصوم لغزشوں کی نشان دہی بھی کی ہے، تو وہ فحاشی کے زُمرے میں آنے سے بچ جائے گا۔ یقیناً ان اسباب کی بنا پر ایسے ادب کو فحشیات سے تعبیر کرنے میں کسی کو کوئی لیت ولعل نہیں ہوگا۔ کیوں کہ جنسی محرکات کو غیر متوازن اور لذّتیت کے ساتھ پیش کرنا بھی ایک تخریبی عمل ہے۔ اسے ہم صرف ایک حیوانی جذبہ کہہ سکتے ہیں۔ چوں کہ اس کا صحت مند معاشرے پر منفی تاثّر قائم ہوتا ہے۔ ذہن فوری طور پر نفسانی خواہشوں کی بجا آوری کے لیے متحرک ہوجاتا ہے، اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا اثر صرف خام ذہن ہی قبول کرے گا، بلکہ سماجی زندگی کا کوئی بھی ذی شعور اور ہوش مند فرد اس عمل سے ذہنی انتشار اور انحطاط کا شکار ہوسکتا ہے۔ اُس کے معصوم جذبات مشتعل ہوسکتے ہیں۔ کیوں کہ جذبات پر کوئی حد قائم نہیں کی جاسکتی۔ اسی لیے جذبات میں کوئی روک بھی نہیں ہوتی۔

منٹو کا افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' کے مقدّمے میں گواہانِ صفائی میں صوفی غلام مصطفی بھی شامل تھے۔ عدالت میں انھوں نے ''فحاشی'' اور ''فحش'' کے بارے میں بڑے ترقّی پسندانہ خیالات پیش کیے۔ لفظ ''فحش'' کی بابت فرمایا:

> ''کوئی افسانہ یا ادب پارہ فحش نہیں ہوسکتا، جب تک لکھنے والے کا مقصد ادب نگاری ہے۔ ادب بحیثیت ادب کہ کبھی فحش نہیں ہوتا۔''(۷)

درحقیقت فحاشی انسانی جذبات و احساسات پر کُلّی طور پر غالب آکر انسان کے عقل وخرد کو گُمراہ کردیتی ہے۔ جس سے وہ فحش کاری کی جانب راغب ہوجاتا ہے۔ جنسی بے راہ روی جنسی تشدّد کے اثرات نمایاں ہوکر اُس کی شخصیت کو مسخ کردیتے ہیں۔ جنسی مریض اس عیب سے زیادہ متاثّر ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود جنس کے بارے میں ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ وہ قطعاً کوئی گندی، غیر شریفانہ اور غیر مہذّب شے نہیں۔ سماجی تطہیر کے لیے بسا اوقات جنس نگاری سے کام لیا جاتا ہے۔ سعادت حسن منٹو اور ڈی ایچ لارنس کی طرح بہت سے تخلیق کاروں نے جنس نگاری کو سماجی احتیاج کا ذریعہ بنایا۔(۸) جنس کا بیان ہر دور کی طرح ادب میں جاری وساری رہا ہے۔ کہیں یہ مسرّت اندوزی کا مظہر بنا ہے تو کبھی اس کے ذریعے دل و دماغ میں ناپاک اور شہوت انگیز خیالات پیدا ہونے کے امکانات بھی پیدا ہوئے ہیں۔ بلاشبہ ادب میں نشاط انگیز یا جذبات کو برانگیختہ کرنے والی تحریروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ حقیقتاً ادیب کی ذرا سی کوشش کسی بھی تحریر کو فحش اور غیر فحش بنا سکتی ہے۔ اُس کا طریقِ استعمال اور طریقِ واردات ہی فحش اور غیر فحش کا فرق ظاہر کرتا ہے۔ شعروادب میں معاشی، نفسیاتی، سماجی، معاشرتی مسائل کی ترجمانی کرتے وقت ایسے کتنے ہی موضوعات سامنے آتے ہیں کہ جہاں فن کار غیر ضروری جزئیات اور لذّتیت سے گُریز کرکے اپنے فن پارے کو فحش ہونے سے بچا سکتا تھا، لیکن اُس نے اُسے جیتے جاگتے مرقّعے میں لذّتیت کے تخریبی عنصر کو شامل کرکے قارئین کو اپنے ساتھ ملالیا۔ بالکل اسی طرح فن کار کسی ایسے ہی چُلبلے، انوکھے اور منفرد موضوع پر جنسی جذبات اور

جنسی تکنیکوں کے بارے میں اشتعال انگیز تفصیلی گفتگو کرسکتا تھا، لیکن اُس نے اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہوئے متوازن طریقِ کار اختیار کیے رکھا اور فن اور موضوع کے ساتھ بھی پورا پورا انصاف کیا، لیکن اس قسم کے موضوعات میں جو عصمت فروشی، عشق وعاشقی، امرد پرستی، ہم جنسیت اور بلوغت وغیرہ سے تعلّق رکھتے ہیں، اُس میں یہ دیکھنا از حد ضروری ہے کہ اُن جنسی مسائل کی پیش کش میں موضوعات سے متعلق زبان، ماحول، جزئیات وغیرہ اصل رنگ میں پیش ہوئے یا نہیں، اگر فن کار نے اپنے فن سے پوری طرح واقفیت کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے حقیقی معلومات فراہم کردی ہیں، جو تخلیق کار کے پیشِ نظر رہی تھیں، تو گویا اُس نے موضوع کا حق ادا کردیا۔ چوں کہ اس نوع کے موضوعات، اس سے متعلّق معلومات اور پھر جنسی انکشافات موقع محل کی مناسبت اور فنی ضرورت کے تحت ہی کیے جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اسے مخصوص حلقوں میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک تو وہ فن پارہ گندگی، فحاشی اور بے ہودگی کا اعلیٰ نمونہ قرار پاتا ہے۔ حالاں کہ مصنّف تخلیق کو پُرکشش بنانے کے لیے بے جا جنسی کیفیات کو پیش کرنے سے بچتا ہے، عموماً جنسی جذبوں کی تفصیلات اور کثرت سے گریزاں ہونے کے باوجود تخلیق کو زمان ومکان اور حقیقت سے ہم آہنگ کرنے کے لیے کہیں کہیں، کچھ کچھ جنسی اہتمام اور مثبت شعوری کوششیں بھی کرنا پڑتی ہیں۔ جسے ہم صرف اور صرف موضوع، فن اور مصنّف کی مجبوری کہہ سکتے ہیں۔ اس پر بھی اگر فحاشی اور جنسی ہیجان کا جواز گھڑلیا جائے، تو ہم اِسے معترضین کی لاعلمی ہی پر محمول کریں گے۔

''فحاشی کے اِس جائزے کے بعد ہم مختصراً ''عریانی'' کی بھی وضاحت کرتے چلیں۔ اردو لغت میں ''عریانی'' سے مراد: برہنگی، ننگا پن، جنسی معاملات کا کھلا اظہار و بیان ہے۔[۹] عام طور پر اردو ادب میں ''عریانی'' سے مراد جنسی سرگرمیوں میں بے باکی، بے حجابی، بے پردگی، برہنہ پن اور بے لباسی کے بے روک اظہار سے ہے۔ یعنی دانستہ سماجی حدود وقیود سے کنارہ کش ہوکر آزادانہ طور پر کھلے بندوں مخصوص اعضاے جسمانی (انسان وحیوان) کو بِلاضرورت اور بِنا رمز وکنایہ اور تشبیہات واستعارات کے بیان کیا جائے، تو اس سے مراد عریانی اور برہنگی ہوگی، یعنی عریانیت لذّت سے عاری ہوتی ہے، اگر عریانیت کی اس کیفیت میں بدکرداری اور بے حیائی کو شامل کرکے محض جنسی حظ بہم پہنچانے کی خاطر برہنہ الفاظ لذّت کے ساتھ دل بستگی کا ایسا سامان فراہم کردیا جائے، جس میں جابجا ترغیبی عناصر کارفرما ہوں، تو اسے فحاشی کہا جائے گا۔ اردو ادب میں ''فحاشی'' اور ''عریانی'' کو ہم معنی الفاظ کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اِن میں تفہیمی سطح پر باہمی فرق ہونے کے ساتھ ساتھ گہرا تعلّق اور ربط بھی موجود ہے، کیوں کہ بسا اوقات بعض تحریریں عریانی کو پیش کرتے کرتے فحاشی کے زُمرے میں داخل ہوجاتی ہیں؛ یعنی اشاروں کنایوں سے تہی محض چند جملے جس میں ترغیب اور جنسی تلذّذ کی کارفرمائی ہو، کسی بھی تحریر کو عریانی سے فحاشی کی صف میں شامل کردیتے ہیں۔ عریانی اور فحاشی کے اس فرق کو ''کشّاف تنقیدی اصطلاحات'' میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''جنسی معاملات کا اظہار و بیان ہر معاشرے میں کچھ رمز وکنایہ اور ایما و اخفا کا تقاضا

کرتا ہے۔ اس معاشرتی تقاضے کو نظر انداز کرنا ادبی اصطلاح میں عریانی کہلاتا ہے اور جب عریانی کا مقصد محض جنسی تلذّذ ہو، تو فحاشی ہے۔ ادب وفن میں عریانی محض جوان طبیعتوں کی شوخی بھی ہوسکتی ہے۔ زندگی کی ترجمانی یا مصوّری میں غلو بھی بعض اوقات عریانی پر منتج ہوتا ہے۔ بعض اوقات بدلتے ہوئے معاشرتی ماحول کے باعث ایک تحریر کو جو پہلے عریاں نہیں سمجھی جاتی تھی، بعد میں عریاں سمجھا جانے لگتا ہے۔ اگر شاعر عریاں نگاری کو کسی بلند مقصد کے حصول کے لیے ذریعے کے طور پر استعمال کرتا ہے، تو یہ جائز ہے اور اگر عریانی بلند مقصد کی خاطر نہ ہو، بلکہ خود مدعا بن جائے، تو یہ قابلِ اعتراض ہے، کیوں کہ ایسی عریانی محض شہوانی جذبات کی برانگیختگی یا محض جنسی تلذّذ پر منتج ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایسی عریانی کو محض عریانی کی بجائے فحاشی کہنا مناسب ہوگا۔''(۱۰)

''عریانی'' کے ضمن میں یہ امر بھی پیشِ نظر رکھنا انتہائی ضروری ہے کہ مختلف قوموں اور مختلف زمانوں میں اخلاقی لحاظ سے عریانی کا مفہوم مختلف رہا ہے۔ اقوامِ مغرب اور یورپ کے سماجی و معاشرتی ماحول میں اقوامِ مشرق کی نسبت زمین وآسمان کا فرق ہے۔ معاشرتی سطح پر عورت کو جو آزادی انھوں نے کئی صدیوں سے دے رکھی ہے، ہمارے یہاں آج بھی اُس کا عشرِ عشیر دیکھنے کو نہیں ملتا۔ ایشیائی اور عرب ممالک میں عورت کا ادب واحترام اور باپردگی میں بہ نسبت مغرب اور یورپ کے کافی تفاوت ہے۔ جن باتوں کا اظہار ہمارے معاشرے میں فحش اور عریاں تصوّر کیا جاتا ہے، وہ اُن کے نزدیک اتنا معیوب کُن نہیں سمجھا جاتا ہے۔ معاشرتی نظام کے اس فرق کے ساتھ اُن کے اور ہمارے ادب میں بھی خاصا بُعد ہے۔ بالکل اسی طرح زمانی اعتبار سے ہمارے یہاں بھی فحاشی اور عریانی کا تصوّر تبدیل ہوتا رہا ہے۔ متقدّمین، متوسّطین اور متأخرین کا سرمایۂ ادب اور ادبی تاریخیں اس امر کی بخوبی نشان دہی کرتی ہیں۔ چناں چہ فحاشی وعریانی کے حوالے سے اس بات کو اگر مدِّنظر رکھ لیا جائے، تو اس کی درجہ بندی یا امتیاز کرنے میں چنداں مشکل نہ ہو۔

عریانی اور فحاشی کے حوالے سے جنسیات کی تاریخ پر اگر ہم نظر دوڑائیں، تو سب سے پہلے انسان کی ارتقائی حالتوں پر ہماری نظریں پہنچتی ہیں۔ اس ضمن میں علّامہ نیاز فتح پوری نے بڑی عرق ریزی سے تاریخی حقائق بیان کیے ہیں۔ ان کے مطابق عہدِ حاضر کے تمدّن سے پہلے یہ انسان تین کیفیتوں سے گزر چکا ہے۔ اوّل اُس کی زندگی کا انحصار شکار رہا۔ دوم مویشی بانی اختیار کی اور سوم فلاحت وزراعت۔ سب سے پہلے شکاری دور میں افزائشِ نسل کا مسئلہ اُس کے لیے اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ اُسے یہ علم تھا کہ جس قدر شکاریوں کی تعداد کم ہوگی۔ اُسی لحاظ سے شکار وافر مقدار میں ملے گا۔ لہٰذا جنسی تعلّق کی کوئی اہمیت اُس کے نزدیک نہیں تھی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جب اُس نے دیکھا کہ کئی دن تک شکار دستیاب نہیں ہوتا، تو اُس

نے حکمتِ عملی کے تحت جانوروں کے بچّے پکڑ کر پالنا شروع کر دیے، جس سے وہ مویشی بانی کی کیفیت میں آ گیا۔ اس حالت میں اُسے مویشیوں کی نگہداشت کے لیے جب خاندان بڑھانے کی ضرورت کا احساس ہوا، تو پھر اُسے تعلّقِ جنسی کی ضرورت و اہمیت محسوس ہوئی۔ پھر جب وہ اس حالت سے گزر کر زراعت کی جانب متوجّہ ہوا، تو پہلے سے زیادہ افراد کی ضرورت پڑی، جو کھیتی باڑی اور چوپانی کے کام کو بخوبی انجام دے سکیں۔ یہی وہ مقام ہے، جب افزائشِ نسل کے دیوتاؤں کی پوجا اور انھیں شاد کرنے کے لیے مختلف فحش قسم کی رسمیں گھڑنا پڑیں۔(۱۲) عہدِ قدیم سے شروع ہوئی مختلف اقوام وملل کی مذہبی رسوم میں اعضاے جنسی سے دلچسپی، اس کی پرستش اور اُن کے عبادت گاہوں میں برہنہ شکلیں اور جنسی افعال، انسان کے نفسانی جذبات کو بڑھاوا دینے کا موجب بنے ہیں۔ ''یونی پوجا'' سے لے کر ''لنگ پوجا'' تک کا تصوّر اپنے اپنے عہد، معاشرے، قوم اور علاقے میں نہایت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ انسانی مذاہب کی یہ علامتی فحاشی اور عریانی عہدِ جدید تک اپنی مختلف بنتی بگڑتی شکلوں میں رہی ہے۔ حسن و جمال کی نمائش نے جنس نوازی کو رفتہ رفتہ مذہبی اور سماجی روایات میں عریانی اور فحاشی کو غیر معمولی ترقّی دے دی۔ ہمارے سماج کے ناروا سلوک نے قدرت کے حسین تحفے کو طوائف کا روپ دھارنے پر بھی مجبور کیا۔ بِلا ریب عورت روزِ ازل سے مرد کے حواس پر چھائی ہوئی ہے۔ جب ہی تو ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخِ عالم میں اسے پانے کی جستجو میں لاکھوں افراد موت سے ہم کنار ہوئے۔ سلطنتوں کے زوال اور نسلِ انسانی کی گُمراہی میں اِس کا بڑا کردار رہا ہے۔ دوسری جانب اِسی عورت نے مرد کے لیے سامانِ راحت اور سرمایۂ عیش وطرب بھی فراہم کیا۔ سلاطین، امرا، نوابین کی طرح فن کار، شعرا، ادبا وغیرہ بھی ان کی طرف متوجّہ ہوئے۔ ان سے راہ ورسم رکھنے کے لیے اُن کے آستانوں کا طواف بھی کیا۔ اس میں بہت سی سربرآوردہ ہستیوں کے نام بھی آتے ہیں، جنھوں نے اپنی فطری خواہشوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیا۔ اِس ضمن میں شورش کاشمیری نے ادب کی کچھ مقتدر ہستیوں کے بارے میں دل چسپ معلومات فراہم کی ہیں:

> ''سرسیّد شوق سے گانا سنتے تھے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کے لیے چندہ فراہم کرتے وقت انھوں نے ایک طوائف سے بڑی رقم حاصل کی۔ مولانا شبلی بھی آواز کا شوق فرماتے رہے ہیں۔ شرر مرحوم بھی چوک میں ہو آیا کرتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد غبارِ خاطر میں اپنی آشفتہ سری کا اقرار کر چکے ہیں، مولانا محمّد علی سیاسی سفر میں بھی فیض آباد کی آواز سُن آیا کرتے تھے۔ علاّمہ اقبال کی امیر ابھی پچھلے دنوں مری ہے..... داغ کے ہاں بھی ایک طوائف تھی۔ ''لیلا کے خطوط'' کی محرّک کون ہوئی۔ منی جان جو قاضی عبدالغفار کے حرم میں تھیں۔ اکبر الٰہ آبادی نے بوٹا بیگم سے نکاح پڑھوایا تھا..... حشر مختار کو جی جان سے چاہتے تھے، امیر سے کبھی اقبال کا ذکر آتا تو وہ مسکرا دیا کرتی۔''(۱۲)

شورش کاشمیری نے بڑی ہمّت کی کہ ادب کی ان چند قدآور شخصیات کی اخلاقی لغزشوں کی کارگزاریوں کو ضبطِ تحریر میں لے آئے۔ حالاں کہ ہمارے یہاں سوانح نگار سے لے کر خاکہ نگار تک کسی بھی شخصیت پر لکھتے وقت اُسے فرشتہ یا ولی کے رُوپ میں پیش کرتا ہے۔ جس میں وہ صرف خوبیوں اور نیکیوں کا مجسم پیکر ہی دکھائی دیتا ہے۔ اُسے بلند قامت اور فرشتہ صفت ثابت کرنے کے لیے دانستہ اُس کی خامیوں سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے، جو یقیناً بڑی بد دیانتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس عالمِ رنگ و بو سے کسی بھی شخص کا بچ نکلنا محال ہے۔ زندگی کی آلائشوں اور گرد و بار سے کہیں اور کسی نہ کسی موقع پر اُس کا دامن آلودہ ہو ہی جاتا ہے۔ پھر ایسی صورت میں ان شخصیات کی پوری زندگی کا احاطہ کرتے وقت بُرائیوں اور خامیوں سے پردہ پوشی کر کے اُسے دیوتا بنا کر پیش کرنا انتہائی زیادتی ہے۔ اردو کی ادبی تاریخ میں چند نام ہی ایسے سامنے آتے ہیں، جنھوں نے اخلاقی جرأت سے کام لیتے ہوئے شخصیات کے بھلے بُرے دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ شاہد احمد دہلوی اور سعادت حسن منٹو نے یہ فریضہ انتہائی جرأت مندی سے ادا کیا۔ منٹو نے مغربی خاکہ نگاروں اور سوانح نگاروں کی طرح بغیر کسی لگی لپٹی کے کرداروں کے معائب و محاسن بیان کر دیے۔ مشاہیرِ ادبا اور فن کاروں پر لکھے گئے اُن کے خاکوں سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ انھوں نے شخصیات کی تعریف و توصیف کے علاوہ بُرائیوں، کوتاہیوں اور جنسی زندگی کو تفصیل سے موضوع بنایا ہے۔ ''نور جہاں''، ''تین گولے''، ''مرلی کی دُھن'' وغیرہ اس کی مؤثّر مثالیں ہیں۔ اردو زبان میں ان چند ادیبوں کی تصانیف کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی بعض نامور شخصیات کی زندگی کے کچھ گوشے دنیا کی رعنائیوں اور مادّی لطافتوں سے لطف اندوز ہونے میں صرف ہوئے ہیں۔ چوں کہ شراب و شباب اور ناچ و راگ کی محفلوں نے ان کے دامنِ دل کو اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنے دل اور دماغ اور فطری جذبات کی پوری بجا آوری کی۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ ایک زمانے تک رقص و موسیقی کو سرکاری سرپرستی حاصل رہی تھی۔ ناچنے گانے والیاں محفلوں میں اپنے فن کا پوری آزادی کے ساتھ مظاہرہ کرتی تھیں اور اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کی بدولت شہرت اور دولت حاصل کرتیں۔ اس قسم کی محفلوں میں ہونے والے مجروں کو معاشرے میں قطعاً بُرا نہیں سمجھا جاتا تھا، البتّہ جسم فروش عورتیں بے حیائی اور فحاشی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

دنیا کے کسی خطّے میں جنسی روابط، رُجحانات و میلانات اور جذبات و احساسات کا تعلّق وہاں کے سماجی ماحول اور سماجی اقدار کے ساتھ ہوتا ہے، جو جنسی عناصر کو پنپنے اور روکنے کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ سماجی انسان جس کی جڑیں معاشرے کے اندر تک پیوست ہوتی ہیں۔ وہ معاشرتی قواعد، قوانین اور اصول و ضوابط کی کسی حد تک پاسداری کرتا ہے۔ شاعر و ادیب جو کہ معاشرے کا ایک اہم فرد ہوتا ہے، بعض اوقات اُس کے تجربات و مشاہدات کسی حد تک فنی تخلیقات کے لیے مؤثّر اور کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ چوں کہ عام فرد کی نسبت ان کی نظر میں زیادہ گہرائی و گیرائی ہوتی ہے۔ جس کی بابت وہ جنسیات کے پیچ و خم کو بہتر انداز میں پیش کرتا ہے۔ لہٰذا ابتدا ہی سے شعر و ادب میں جنسی جذبات کی کارفرمائی نظر آتی ہے، چوں کہ جنس زندگی کی اہم ترین ضرورت بھی ہے۔ اس لیے اس کا اظہار مختلف طریقوں اور انداز سے کیا جاتا رہا ہے۔ نثری و شعری ادب میں انسانی

زندگی کے اس بنیادی جذبے کو پیش کرتے وقت انتہائی محتاط رہنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ دیگر موضوعات کی نسبت اس میں حسّاسیت زیادہ ہوتی ہے۔ ذرا سی بے اعتنائی ،لغزش اور بے پروائی اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔جس سے بعض اوقات وہ فحاشی اور عریانی کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

ہندوستانی تہذیب اور وہاں کی قدیم زبانوں کی شاعری اور ادب میں عشق ومحبّت اور جسمانی ملاپ کی داستانوں کا سُراغ کثرت سے ملتا ہے۔ چوں کہ مسلمان فاتحین کی آمد اور اقتدار حاصل کرنے سے پہلے تک ہندوستانی سماج میں مرد وزن کو باہمی میل جول اور بول چال میں مکمّل آزادی حاصل تھی۔ پردے کی اس آزادی نے عورت کو مرد سے بہت قریب کر دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عشقیہ شاعری میں جنسی اختلاط اور جنسی واردات کو فروغ حاصل ہوا۔ اردو کے غزل گو شعرا نے فارسی غزل کی تقلید میں جب غزل گوئی کی ابتدا کی تو عشقیہ مضامین کے علاوہ زیادہ تر مرد ہی موضوع بنا رہا۔مردوں سے عشقیہ اظہار اس دور کی حقیقی تصویریں ہیں، لہٰذا شاعری میں خوبرو اور حسین لڑکوں کو غزل کا محبوب بنا کر بزمِ غزل کو آراستہ کیا گیا۔ بعد ازاں محبوب کی اس حُسن آرائی کو تصوّف کا نام بھی دیا گیا۔ اس عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کا زینہ بتایا گیا۔ حالاں کہ شعرا کا واضح اور انفرادی جنسی رُجحان اس امر کی نفی کرتا ہے۔ البتّہ صوفی شعرا کے بارے میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اُن کے صوفیانہ خیالات بوالہوسی سے منزّہ تھے۔اردو شاعری کے اس اوّلین دور میں حسن پرستی کو جو عروج حاصل ہوا اور جذبۂ عشق کو لطف لے لے کر بیان کیا گیا۔ اُس نے محبّت کے مفہوم کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ مجازی محبّت میں ہوس اور شہوت در آئی۔ شعرا انسانی فطرت کے مطابق مادّی جسم کی طرف راغب ہوئے۔ جب عشقی وعاشقی کا سلسلہ چل نکلا تو جنسی محبّت کو ایک مستحسن فعل گردانا گیا، عریاں اور کھلّم کھلا اظہار ایک روحانی اور جاودانی جذبہ تصوّر کیا جانے لگا۔ جنسی اعضا کے نام اور جنسی اختلاط کی تفصیلات کو بیان کرنے میں پس وپیش کرنے کی بجائے زیادہ صاف اور بے باکی سے پیش کیا گیا۔ استلذاذ بالمثل کی صدائے بازگشت بہت عرصے تک اردو شاعری میں سنائی دی جاتی رہی۔ اگلے دور کے شعرا نے پچھلوں کی روایت کو احترام بخشا۔ چناں چہ محمّد قلی قطب شاہ اور ولی دکنی سے لے کر میر تقی میر اور بعد تک یہ سلسلہ جاری وساری رہا۔ محمّد قلی قطب شاہ کے کلام میں جنسی جذبات کی کارفرمائی نمایاں رہی ۔ ان کی اپنی زندگی کا ماحول ایسا تھا کہ وہاں ہر طرف عورت ہی عورت جلوہ گر ہے۔ نتھّی ، سانولی، کوئلی، پیاری، گوری، چھبیلی، لالہ لالن، موہن، محبوب، بلقیس زمانی، حاتم، ہندی چھوری، پدمنی، سُندر، سجن، رنگیلی، مُشتری، حیدر محل وغیرہ محمّد قلی قطب شاہ کے کلیات کی پیاریاں ہیں۔(۱۳) ولی دکّنی کے ہاں جنسی احساس اُس زمانے کی روایتی شاعری ہی کی طرح نظر آتا ہے۔ جب کہ میر کے کلام میں ہم جنسی رُجحان کی متعدّد مثالیں نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتی ہیں اور ان کا عطّار کا لڑکا تو زبانِ زدِ خاص وعام ہے۔

میرؔ کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب — اُسی عطّار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں(۱۴)

کیا میرؔ تو روتا ہے پامالیٔ دل ہی کو — ان لونڈوں نے تو دلّی سب سر پہ اُٹھالی ہے(۱۵)

کیا اس آتش باز کے لونڈے کا اتناشوق میرؔ　　بہہ چلی ہے دیکھ کر اُس کو تمھاری رال کچھ(۱۶)
ترش رؤ بہت ہے وہ زرگر پسر　　پڑے ہیں کھٹائی میں مدّت سے ہم(۱۷)

میرؔ کے کلام میں امرد پرستی کا یہ رُجحان ادبی روایات اور معاشرے کا پیدا کردہ تھا۔ بادشاہ اور اُمرا تک اس لت میں گرفتار ہوگئے تھے۔ اس کا اندازہ خواجہ سراؤں کی محلات میں غیر معمولی اہمیت سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ ایسے زوال پذیر معاشرے میں شعرا کی شاعری میں امرد پرستی کا رُجحان تاریخی حقائق وصداقت کی بھی ترجمانی کرتا ہے اور میر کا لونڈوں سے اظہارِ عشق اس شعری روایات یا معاشرتی روایات کا نتیجہ لگتا ہے۔ کیوں کہ لڑکوں سے محبّت کا اظہار پر میر کے علاوہ اُن کے معاصرین اور دیگر معتبر ومحترم شعرا نے بھی اپنی بساط کے مطابق کیا۔ امرد پرستی کے اس دور میں کہ جب مرد اپنے ہم جنس کے لیے رطب اللّسان بنا ہوا تھا۔ عورت سمٹ کر چار دیواری میں مقیّد ہوگئی تھی اور اس کی جگہ بازاری عورت منظرِ عام پر آ گئی تھی۔ گھریلو عورت پر طوائف کے تفوق نے نوابین وامرا کی طرح شاعر وادیب کو بھی متأثّر کیا۔ ایک طرف عورت کی جنسی گھٹن اور دوسری جانب عورت کی جنسی آزادی نے انھیں کے جذبات کی تصویر کشی کے لیے مجبور کیا۔ لہٰذا ادب کے افق پر ''ریختی'' نمودار ہوئی۔ لکھنوی معاشرے میں اس صنف کو عروج حاصل ہوا۔ عورتوں کی زبانی اُن کی جنسی بھوک، گھٹن اور مرد کی جانب سے بے اعتنائی کا ذکر اس صنفِ شاعری میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ سعادت یار خاں رنگین، انشا اور میر یار علی المتخلص بہ جان صاحب وغیرہ جیسے شعرا عورتوں کی ہم جنسی محبّت کو بیان کرنے میں پیش پیش تھے۔ بعض ریختی گوؤں کی جانب سے سفلی جذبات کو برانگیختہ کرنے میں نمایاں حصّہ لیا گیا۔ اسی طرح عاشقانہ جذبات بیان کرنے کے لیے ریختی میں معتدل رویّہ بھی اختیار کیا گیا، لیکن شاعری کی نسائی فضا زیادہ عرصے اس کی متحمل نہیں ہوسکی، بہ حیثیتِ مجموعی اس منفرد صنف میں جنسی تسکین کے علی الاعلان اور عریاں پہلو کثرت سے دکھائی دیے۔ اس ضمن میں کچھ شعرا فحش گوئی کی بنا پر بدنام بھی ہوئے۔

دونوں پاؤں کو پکڑ کر لیے آسن جس دَم　　پائجامے کو اُتارا مجھے عریاں کیا
رکھتے ہی اپنا بدن میرے بدن کے منہ پر　　کھینچ کر مجھ کو ذرا اور جو اس آن کیا
آگئی چیر بدن میں تو لہو بہنے لگا　　ساری چادر کے تئیں خون میں افشاں کیا(۱۸)
چبھتی ہے یہ تو نگوڑی مجھے بھاری انگیا　　کوئی سادی سی مرے واسطے لاری انگیا
ہاتھ انشا کا کہیں چُھو جو گیا تو بولیں　　تیرا مقدور کہ تو چھیڑے ہماری انگیا(۱۹)

شعرائے کرام نے عورتوں کے درمیان جنسی تعلّقات کے عریاں نقشے صرف ریختی ہی میں نہیں کھینچے ہیں، بلکہ مثنوی میں بھی جا بجا عورت کی رنگا رنگ کیفیات کا اظہار ملتا ہے، تاہم مثنویوں میں ریختی کے اثرات کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ صنفِ نازک کی عملی ہم جنسیت بہ نسبت ریختی کے کہیں کہیں زیادہ تفصیل کے ساتھ ملتی ہے۔ اردو مثنویات میں میر حسنؔ کی ''سحرالبیان'' اور دیا شنکر نسیم کی ''گلزارِ نسیم'' کو بلند مرتبہ حاصل ہے، جب کہ نواب مرزا شوق کی ''زہرِ عشق'' کو بھی چند اہم

مثنویوں میں شمار کیا جاتا ہے، اگر میر حسن اور مرزا شوقؔ کی مثنویوں کا مطالعہ کیا جائے، تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں جنسی عناصر کی کارفرمائی نہیں یا شاعر نے شاعرانہ انداز میں سماج کے اندر دبی ہوئی جنسی خواہشات کے اظہار کو نمودار نہیں کیا ہے۔ صنفِ نازک کی طرح صنفِ مخالف کا جنسی اور فطری میلان ان مثنویوں میں جگہ جگہ مترشح ہے۔ ان میں کہیں عریاں تو کہیں مبہم انداز میں جنسی دل چسپیوں کا اعلان ہوا ہے۔ خاص کر ''زہرِ عشق'' تو اپنی عریاں نگاری کی وجہ سے ایک زمانے میں بدنامی کا داغ بھی مول لے چکی ہے۔ یہ مثنویاں جو کبھی طربیہ تو کبھی المیہ صورتِ حال کو واقعاتی انداز میں پیش کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہیں۔ ان میں ایسے کتنے ہی مقامات آتے ہیں۔ جہاں جنسی حسیات کی لو کہیں مدّھم تو کہیں تیز تر ہو جاتی ہے اور کبھی وہ انسانی جسم میں سنسناہٹ اور گدگداہٹ پیدا کر کے جنسی تلذّذ اور شہوانیت کی محرّک بنی ہیں۔ شاعر جنس کی ان گہری لذّت کو موقع بہ موقع بیان کرنے سے کہیں نہیں جھجکا، لیکن اس کے باوجود اہلِ ذوق حضرات کی نظر میں ان کی ادبی حیثیت مسلّم ہے، بلکہ مصوّری، منظر نگاری، بے ساختگی، سوز و گداز، داخلی احساسات، تہذیب و ثقافت، اثر انگیزی اور بندشِ الفاظ کی بنا پر اردو کی چند لافانی مثنویوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ دراصل شعر و ادب میں حسن و عشق، ہجر و وصال اور اعضائے نسوانی کے اذکار میں جنسی جذبہ و احساس کا در آنا کوئی انھونی بات نہیں۔ بالخصوص شاعری میں وارداتِ عشق اور ملن کی حدّت انگیز تصویریں اُس کے سوز و ساز اور رچاؤ میں بالیدگی عطا کر دیتی ہیں۔ اسی لیے اردو شاعری بھی جمالیاتی اور روحانی آسودگی بہم پہچانے کی خاطر ان تذکروں سے خالی نہیں۔ بالکل اسی طرح مثنویات میں بھی جنسی تعلّق کا عریاں بیان حزن و ملال اور اضمحلال کے بجائے جمالیاتی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔ ان مثنویات سے کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

تم پہ مرتی کیا قیامت تھی — کیا مرے دشمنوں کی شامت تھی
جان پاپوش سے نکل جاتی — پر طبیعت نہ یوں بدل جاتی
حسرتِ دل نگوڑی باقی ہے — اور یہاں رات تھوڑی باقی ہے (۲۰)

گود میں اپنی پھر بٹھالو جان — پھر گلے سے ہمیں لگا لو جان
ڈال دو پھر گلے میں بانھوں کو — پھر گلوری چبا کے منہ میں دو
میں دل و جاں سے ہوں فدا تیری — لے کے مرجاؤں میں بلا تیری (۲۱)

لب سے لب ملائے رکھنا — بازو سے وہ سر اُٹھائے رکھنا
وہ ہاتھ کو دمبدم جھٹکنا — وہ تکیے پر سَر کو دے ٹپکنا
وہ چیں بجبیں ہو کے کہنا — کن بے کسیوں سے روکے کہنا
ہے تم کو یہ ہی شغل دن رات — اچھی نہیں لگتی مجھ کو یہ بات
بھرتا ہی نہیں ہے تیرا جی بس — کرتا ہی نہیں ہے تو کبھی بس (۲۲)

وہ بیٹھا جو خلوت میں آ بے نظیر — اور ایدھر سے آئی جو بدرمنیر
پکڑ ہاتھ مسند پہ کھینچا اُسے — محبّت کے رشتہ میں اینچا اُسے
ہوئے جب وے بدمست دو ماہ رو — لگی ہونے اُن میں عجب گفتگو
لگے پینے باہم شرابِ وصال — ہوئے نخلِ اُمید سے وہ نہال
کسی کی گئی چولی آگے سے چل — کسی کی گئی چین ساری نکل(۲۳)

دنیاے ادب کی جولان گاہوں میں عشق ومحبّت کے بے پایاں جذبے کو پیش کرتے وقت جنسی جذبات یا عریاں حقیقتوں سے شاید ہی کوئی ادیب دامن بچا سکا ہو۔ بے شک شاعری میں روایتی اثرات اس کے جنون میں مزید اضافے کا محرّک بنتے ہیں۔ ہماری شعری روایات نے جنسی جذبات کی ترغیب اور تحریک میں مؤثّر کردار ادا کیا ہے۔ اگر چہ دوسری جانب اردو شاعری میں صحت مند عشق کی جولانیاں بھی آغاز ہی سے متحرک نظر آتی ہیں اور اس کے ساتھ تصوّف کے نظریۂ عشق نے پاکیزگی اور طہارت کی منزلیں سر کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، اگر ہم اردو شاعری کے سرمائے پر تاریخی نظر دوڑائیں، تو اس میں صحت مند عشق ومحبّت کے معاملات کو بیان کرنے کا ایک بڑا حصّہ نظر آئے گا۔ اسی طرح ہماری شاعری میں جنسی موضوعات پر مبنی تصوّرات ونظریات کی ایک بڑی مقدار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ قدیم شاعری سے لے کر جدید شاعری تک جنسیات کے متنوّع رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ شعرا نے موضوع اور مزاج کے لحاظ سے ان رنگوں کو کہیں شوخ تو کہیں ہلکا استعمال کیا ہے۔ شوخ وشنگ کے ان رنگوں نے کسی جگہ عریانیت کا تاثّر دیا ہے، تو کسی جگہ رنگوں کی بھول بھلیوں نے انھیں فحش بنا دیا ہے، تاہم بہ حیثیتِ مجموعی ان جنسی جذبے واحساس کے رنگوں سے نشاط وکیف اور جمالیاتی آسودگی بہم پہنچانے کا کام زیادہ لیا گیا ہے۔ مصحفی، جرأت، مومن، داغ، نظیر، فراق، اختر شیرانی، جوش، میرا جی، ن م راشد، عبدالعزیز خالد، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض وغیرہ نے جنسی جذبے کو بغیر کسی خوف کے اس طرح برتا ہے کہ اس کی اہمیت وافادیت کا ہر کس وناکس کو معترف ہونا پڑتا ہے، اگر چہ قدیم شعرا سے جدید شعرا تک شاعری کا سفر کئی صدیوں پر محیط ہے، لیکن جنسی تجربات کو دہرانے اور نت نئے تصوّرات پیش کرنے کے رُجحانات بعد کی نسل میں بھی زیادہ شدّت سے دکھائی دیے۔ اس کا اندازہ فہمیدہ ریاض کی ایک نظم ''بدن دریدہ'' سے کیا جاسکتا ہے، جس میں موصوفہ نے زندگی کی ایک اہم حقیقت کو بلا جھجک صاف، بے لاگ اور عریاں انداز میں بیان کیا ہے:

ہاں دہن میں ہے مرے ذائقہ اُن بوسوں کا
جن کو چکھنے سے بھی انکار کیا تھا دل نے
میری رگ رگ میں وہ سیّال
جس سے بچ جانے پر اصرار کیا تھا دل نے

مرے اطراف پتنگوں کی طرح اُڑتے ہیں
مرے بوسے، وہ مرے جھوٹ سے بوجھل بوسے
خون کی چھینٹیں اُڑاتے ہوئے گھایل بوسے
کب کی وہ کشمکشِ ذہن و زباں ختم ہوئی
اک تڑپ باقی تھی سو دشمنِ جاں ختم ہوئی (۲۴)

ہمارے شعرائے کرام کے پاس ایسا بہتیرا کلام موجود رہا ہے، جسے وہ نجی محفلوں میں مزے لے لے کر سناتے رہے ہیں۔جس میں فحاشی اور عریانی اپنے عروج پر ہے۔عریاں اور فحش الفاظ سے لب ریز اس شوقیہ کلام کو اُن شعرا نے کبھی زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہونے دیا،تاہم یہ کلام اصل اور عکسی نقول کی صورت میں آج بھی بہت سے لوگوں کے پاس موجود ہے۔اردو شعر وادب اپنے کسی دور میں جنس نگاری سے تہی دامن نہ رہا۔ اس میں اُسے فحاشی یا عریانی کا احساس تک نہیں ہوا،اگر یہ احساس کہیں اُبھرا بھی تو فنی تقاضوں، فنی اشاروں اور مبہم کنایوں نے اُس کو فوراً دبا دیا۔ دراصل فن کار کی یہی کاوش اُس کی سب سے بڑی متاع بھی ہے کہ اُس نے جنسی جذبات کو جس خوبی سے پیش کیا، وہ حیوانی جذبے کو برانگیختہ کرنے کے بجاے روحانی بالیدگی کا موجب بنے۔غرض یہ کہ ادب میں متقدّمین سے لے کر متاخرین تک جنسیات کی جتنی رنگ آمیزیاں کی گئیں، اُس میں کُھلّم کُھلا، صاف اور عریاں اظہار جگہ جگہ نظر آئے گا اور کہیں حد سے تجاوز کرتے ہوئے ایسی غلاظت آمیز فحش فضا بھی پیدا کی گئی کہ پڑھنے والا اُس سے گھِن کھانے لگے اور کسی حد تک اس کا ذمّہ دار ہندوستانی اور مشرقی سماج ہی ہے۔ جس کی جاگیردارانہ، زمین دارانہ، سرمایہ دارانہ اور شاہانہ اقدار و روایات میں معاشرے کی من جملہ سرگرمیوں میں جنسی سرگرمیاں کارفرما نظر آتی ہیں۔ جہاں معاشرتی روایات نے عیّاشی اور ذوق بخشی کا بازار گرم کر رکھا تھا۔لہٰذا ادب کی کم وبیش تمام اصناف ان مضرات کو پیش کرنے سے پہلو تہی نہ کر سکیں،لیکن یاد رہے کہ ان اصناف میں جنسی سرگرمیوں کے معاملات میں نظم وضبط اور تہذیب واخلاق کے کچھ نہ کچھ ضابطے بھی مقرّر تھے کہ جس کی حتّی الامکان پاسداری بھی یقیناً کی گئی۔ اسی لیے ہمارا ادب بہت سی خرافات سے بچ نکلا۔جس کی بنا پر ہر عہد اور ہر زمانے میں اس کی قدردانی اور قدر شناسی کرنے کے ساتھ اہمیت وافادیت کو تسلیم کیا گیا۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ ادب زندگی کا ترجمان ہے، جب کہ زندگی متنوّع اور رنگا رنگ ہے۔عہدِ آفرینش سے لے کر تا حال یہ مسلسل ارتقائی مراحل طے کر رہی ہے اور اس کے ساتھ انسانی شعور بھی مسلسل ارتقا پذیر ہے۔ ادبی شعور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔دراصل ادب زندگی کے حسن وقبح کو روشناس کرانے کا آلۂ کار ہے۔ادیب وشاعر اپنے اپنے زمانے کی زندگی کے ہر پہلو کی سیکڑوں نئے اور دل کش پیرائے میں تنقید وتفسیر کرتے ہیں۔ ادیب اپنے فن کارانہ عمل سے ادب میں لطیف سے لطیف اور کثیف سے کثیف واقعات، خیالات اور گمبھیر سے گمبھیر مسائلِ حیات کی ترجمانی دل

فریب اور دل کش انداز میں با آسانی کرسکتا ہے۔ ہزاروں ایسی باتیں جو اَب تک ناگفتہ ہیں یا جو صرف فسادِ خلق کے خوف سے اظہار میں نہیں آسکتیں، ادب کی معرفت بڑی آسانی سے کہی جاسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے سماج میں عموماً جنسی مسائل سے متعلق اظہارِ خیال کو کثیف اور معیوب گردانا جاتا ہے۔ لہٰذا کسی مہذّب محفل میں اس پر اظہارِ خیال بھی آسان نہیں ہوتا، لیکن ادب کا پیرایۂ اظہار کچھ ایسا شُستہ وشائستہ ہوتا ہے کہ جنس کے کثیف سے کثیف پہلو کو اشعار میں ڈھال کر ثقہ سے ثقہ محفل میں سُنایا جاسکتا ہے۔ ایسے اشعار نہ صرف یہ کہ خوشگوار تاثّر چھوڑتے ہیں، بلکہ اگر وہاں صاحبِ ذوق حضرات ہوں، تو اظہارِ بیان کی حُسن کاری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکیں گے اور ان شعرا کے کمالِ ہنر کے معترف ہوجائیں گے۔ اس سے بڑھ کر بھی ادب سماج کے ایسے بہت سے پہلوؤں اور متعدّد ایسی باتوں کو اپنا موضوعِ سُخن بناتا ہے، جو کسی طریقے اور وسیلے سے ہمارے ہاں معرضِ اظہار میں آہی نہیں سکتے، اگر بالفرضِ محال آئیں گے، تو غیر مستحسن، معیوب، فحش، مبتذل، رکیک، غیر ثقہ اور بعض حالتوں میں گردن زدنی قرار پائیں گے۔ جنس کے ذکر سے ادب کبھی تہی دامن نہ رہا۔ جنس کا ذکر ادب میں آیا ہے اور آتا رہے گا اور یہ ذکر اکثر وبیش تر اپنے زمانے کے جنسی میلان کا مظہر ہوگا۔ بعض صورتوں میں انفرادی واجتماعی گھٹن، ناآسودگی، کج روی یا بیماری کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے، تاہم اسے جاننے، پرکھنے اور سمجھنے کے لیے اس جذبے کی تاریخ، ترتیب و تہذیب اور اخلاقیات سے اس کا تعلّق اور اس کے معاشی پس منظر کا جاننا از بس ضروری ہوگا اور اگر معاشرے کو متوازن بنالیا جائے، تو اس کے اظہار کے ذرائع بھی متوازن ہوں گے۔ لہٰذا موجودہ عہد کے ادیبوں وشاعروں پر اس کے اظہار میں بھی بھاری ذمّے داری عائد ہوتی ہے۔ یعنی انھیں یہ دیکھنا ہوگا، بلکہ غور کرنا ہوگا کہ ان کا اظہار کن کن صورتوں میں سماجی اہمیت کا حامل ہے اور کن صورتوں میں وہ فحش نگاری بن جاتا ہے۔ جب تک اُن کا فنی اور سماجی شعور اُن کی رہبری ورہنمائی نہیں کرے گا۔ یہ دشوار گزار منزل سر نہیں ہوسکے گی، معمولی سی کوتاہی ایک اچھے سماجی مسئلے کو فحش بناسکتی ہے۔[۲۵] بہ حیثیتِ ادیب اُسے اپنے منصب اور اپنی ذمّے داریوں کا احساس خود کرنا چاہیے۔ اگرچہ ادب تخلیق کرتے وقت ادیب حقوق وفرائض سے مبرّا ہوتا ہے۔ اُسے مقرّرہ موضوعات کے لیے پابند نہیں کیا جاسکتا۔ اُس کا ادب کسی ایک طبقے اور جماعت کے لیے نہیں، بلکہ ہر اُس شخص کے لیے ہوتا ہے، جو انسان اور زندگی سے آگاہی چاہتا ہو۔ اُسے اس بات کو بخوبی سمجھنا چاہیے کہ اعلیٰ ادب عظمت بخشتا ہے اور ذہنوں کو ترتیب دینے اور روح کو روشن کرنے کا موجب بنتا ہے۔ جب کہ بیمار ادب اخلاقی پستی اور ذہنی قوتوں وصلاحیتوں کو مفلوج کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ چناں چہ قلم کار اپنے قلم کی حُرمت کا خیال کرتے ہوئے اپنے تئیں اظہار کے طریقوں کو اپنی مکمّل گرفت میں رکھے، تاکہ صحت مند ادب پروان چڑھ سکے۔

ادب میں عریانی اور فحاشی کو کسی خاص عہد سے منسوب نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی کسی ادبی تحریک کو اس کا ذمّے دار ٹھہرایا جاسکتا ہے، اگر بالفرضِ محال یہ تسلیم بھی کرلیا جائے، تو ہمارا قدیم وجدید ادب جس کا ذکر اوپر بھی ہوا ہے۔ اُس میں اس کی واضح موجودگی اسے رد کردینے کے لیے کافی ہوگی۔ درحقیقت عریانی اور فحاشی کا تصوّر رفتہ رفتہ ادب میں سرایت کرتا گیا۔

ادبی تاریخوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ تصوّرات ہر عہد میں افراط وتفریط کا شکار رہے، البتّہ یہ ضرور کہاجاسکتا ہے کہ ہر آنے والا دور اس کو بڑھاوا ہی دیتا رہا۔ اسی طرح ترقّی پسند تحریک نے شعروادب میں اسے پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ خاص کر عریاں نگاری کو اس تحریک کے توسّط سے خاصا فروغ حاصل ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ادب میں جنس کا موضوع سب سے زیادہ حسّاسیت رکھتا ہے۔ یہ وہ موضوع ہے کہ جس میں ذرا سی غفلت ادب کی روح کو مجروح کر دیتی ہے۔ بے لگام جنس نگاری ادب میں منفی اقدار کو فروغ دینے میں مؤثّر کردار ادا کرتی ہے۔ غیر صحت مند جنس نگاری ادب کو اُس وقت غیر ادب بنا دیتی ہے، جب اُس میں تواتر کے ساتھ فحش، عریاں اور رکیک مضامین کو شامل کرلیا جائے۔ گو کہ ادب میں جنس نگاری کی حیثیت اب اچھوت کی سی نہیں رہی۔ جنس بھی زندگی کی ایک حقیقت ہے، زندگی کا ایک اہم پہلو ہے اور انسان کے بعض گہرے جذبات جنسی جذبے کے ساتھ نتّھی ہیں، تو لامحالہ ادیب بھی انسانی زندگی کے اس اہم شعبے کو ادب میں مناسب جگہ دیتا ہے۔ خصوصاً جنس کو اُس وقت زیرِ بحث لاتا ہے، جب کسی اہم سماجی مسئلے پر روشنی ڈالنا مقصود ہو۔ اس طرح جنس ادب میں ایک سماجی حوالہ بن جاتا ہے۔ جنس کو ایک تخلیقی خواہش بھی بتایا گیا ہے ، جو انسان میں تخلیقی تحریک پیدا کرتی ہے، لیکن دوسری صورت نقصان دہ ہوتی ہے۔ یعنی یہی جنسی رُجحان جب فحاشی کی صورت اختیار کرجاتا ہے، تو ادب پر مہلک اثرات مرتّب کرتا ہے۔ ادب جنس کو جائز مقام دیتے ہوئے اس کی ارتقائی صورت ہی کو قابلِ قبول سمجھتا ہے۔ ادب میں جنسی بے راہ روی کا تسلسل کے ساتھ تذکرہ مصنّف اور قاری دونوں کے لیے ضرر رساں اور بے سود ہے۔[۲۶] جب کہ ایک مخصوص ذہنیت رکھنے والا گروہ بے وقعت اور بے مایہ تحریروں کے ذریعے ادب کو نقصان پہنچانے کا موجب بنتا ہے۔ ترقّی پسند تحریک کے عروج میں یہ صورت سامنے آئی تھی ، بلکہ نقّادوں کے بعض حلقوں کی یہ رائے تھی کہ فحاشی کو فروغ دینے میں ترقّی پسند سرگرمِ عمل ہیں۔ تقسیم سے قبل کے اخبارات ایسی آرا سے بھرے پڑے ہیں۔ چناں چہ ان باتوں کے پیشِ نظر ترقّی پسندوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کانفرنس کی ایک قرارداد میں فحاشی کی مذمّت کی جائے ،تاکہ اُن پر لگائے جانے والے الزامات کا کچھ نہ کچھ ازالہ ہوسکے۔ لہٰذا ڈاکٹر عبدالعلیم نے فحاشی کے خلاف تجویز کا مسوّدہ ترقّی پسند ادیبوں کی کانفرنس میں پیش کیا۔ احتشام حسین جو اس کانفرنس کی صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انھوں نے ترقّی پسند ادیبوں کا فحش نگاری کے خلاف اس تجویز کے بارے میں حمایت و اختلاف کے حوالے سے رائے لینا چاہی تو حاضرین میں سے مولانا حسرتؔ موہانی کے اچانک کھڑے ہوکر اس تجویز میں ترمیم پیش کرنے کی اجازت نے سب کو حیرت واستعجاب میں ڈال دیا۔ اُن کا موقف تھا کہ لطیف ہوسنا کی کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی طرح فحاشی کی جامع تعریف بھی انتہائی مشکل ہے، ہر شخص اپنے تئیں اس کے مطلب نکالتا ہے۔ الزامات کے خوف اور بددیانت افراد کے حملوں سے پریشان ہوکر ایسی تجویز کو منظور نہیں کرانا چاہیے، جس میں انسانی عشق ومحبّت اور عاشقانہ شعروادب کو مطعون قرار دینے کا احتمال ہو، یوں یہ قرارداد مسترد ہوگئی۔[۲۷] مولانا کی یہ تجویز محض شعروادب کے سرمائے کو محفوظ بنانے کے لیے تھی۔ یہاں اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ

ادب میں بے لاگ جنسیات کے اظہارِ بیان کو ہمیشہ قابلِ قبول تصوّر نہیں کیا گیا۔اس کی شدّت پسندی اور بے جا تقلید کو دیکھتے ہوئے اسے محدود کر دینے کے لیے بھی آوازیں اُٹھائی گئی ہیں۔ سماجی دباؤ کا کچھ نہ کچھ یہ اثر ضرور ہوا کہ جنسی افعال اور اس کے متعلقات کے تذکرے کو ادبی نقطۂ نظر سے قابلِ تحسین متصوّر کرنے والے سر جوڑ کر بیٹھے اور اس کی ادبی اور سماجی مضرت کا احساس کیا۔ چناں چہ ہر سطح پر ادبی فن پاروں میں اعتدال وتوازن کے ساتھ جنسی عناصر کو جگہ دی گئی۔

ہر عہد کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور ادیب وشاعر اُن تقاضوں کے مطابق ادب کی تخلیق کرتے ہیں۔قدیم ادب سے لے کر جدید ادب تک، اس بات کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ رفتارِ زمانہ کے ساتھ سماجی، تہذیبی، لسانی اور فکری شعور میں جیسے جیسے بالیدگی پیدا ہوتی گئی، اسی طرح ادب کی تمام اصناف میں تغیّر وتبدّل آتا گیا۔ خواب وخیال اور ماورائی دنیا سے حقیقت کی دنیا کا سفر ادب نے جس سُبک رفتاری سے طے کیا، اُتنی ہی تیز رفتاری سے ادب نے اندھی تقلید، مغرب پرستی، لادینیت پرستی اور جنس پرستی کے پُرکشش سراب کو عبور کیا۔ ادب میں اگر اظہارِ بیان پر کوئی روک ٹوک اور باز پُرس نہیں، ادب میں کوئی سرحدیں نہیں اور اوپر بیان کی گئی ترقّی پسندوں کی کانفرنس اکتوبر ۱۹۴۵ء[۲۸] اس ضمن میں کوئی خاص کردار ادا نہ کر سکی، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ادب میں حقیقت نگاری کے اونچے سنگھاسن پر بیٹھ کر مذہبی اور اخلاقی قدروں کو بے دردی کے ساتھ پامال کیا جائے۔ شرم انگیز، ہیجان انگیز اور فتنہ انگیز مضامین پیش کرنا ادب پروری نہیں، بلکہ ادب دشمنی کے مترادف ہے۔ادب میں فعلِ جنسی کے پس منظر کو انتہائی سلیقے وقرینے اور اشاروں وکنایوں میں بیان کیا جاسکتا ہے اور کیا جاتا رہا ہے، جس سے اِس امر کا احساس جاگزیں نہ ہو کہ اس میں ذہنوں کو بگاڑنے اور بداطواری کی جانب مائل کرنے کا رُجحان موجود ہے۔صحت مند ادب کی تخلیق ایک سخت محتسب اور نقّاد کی متقاضی ہوتی ہے، جو کم وبیش ہر تخلیق کار کے اندر موجود ہوتا ہے، اگر اسے ملحوظ رکھ لیا جائے، تو نہ صرف ادبی تقاضے پورے ہوں گے، بلکہ ادب کی قدر ومنزلت اور وقعت میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوجائے گا۔ اِس حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اردو ادب کو ثروت مند بنانے اور وقار عطا کرنے میں افسانوی ادب نے مؤثّر کردار ادا کیا ہے۔

اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں دو معروف نام ہی ہمیں ایسے ملتے ہیں، جن پر حکومتِ وقت نے اُن کی تحریروں کو فحش گردانتے ہوئے مقدّمات چلائے۔ وہ نام منٹو اور عصمت کے ہیں۔عصمت کو تو صرف ایک ہی افسانہ ''لحاف'' میں رگیدا گیا تھا، جس میں عصمت کے بقول ترغیب کا سامان موجود نہیں ہے۔[۲۹] جب کہ منٹو کے بعد دیگرے پانچ افسانوں: ''کالی شلوار''، ''دھواں''، ''بُو''، ''ٹھنڈا گوشت'' اور ''اوپر نیچے اور درمیان''[۳۰] میں قابلِ مواخذہ ٹھہرے۔منٹو کی تحریروں پر فحاشی کے حوالے سے جانب دار آرا دینے میں ایسے لوگ بھی شامل ہوگئے، جو منٹو سے ذاتی مخاصمت رکھتے تھے اور جن کا علم وادب سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اسی طرح سے عدالتی کارروائیوں کے دوران بعض استغاثے کے گواہان بھی یہی خوبیاں لیے ہوئے تھے ،لیکن ان مقدّمات میں طرفین کے گواہوں میں ایسے لوگ بھی پیش ہوئے، جو علم وادب میں عالی مقام رکھتے ہیں۔حتّٰی کہ بعض

وکلا اور جج صاحبان بھی شعر وادب سے شغف رکھنے والے نکل آئے۔ان مقتدر ہستیوں کی گواہیوں کا جب وقت آیا، تو انھوں نے تقریباً منٹو کے حق میں گواہیاں دے کر ثابت کیا کہ اُن کے افسانوں میں فحاشی نام کو نہیں ملتی۔اسی طرح منٹو نے بھی مضبوط استدلال، تاریخی اور ادبی حوالوں سے اپنے افسانوں پر لگنے والے فحاشی کے الزامات کو مسترد کیا اور تحریری بیانات کے ذریعے تفصیل سے اپنے موقف کو پیش کرتے ہوئے ان الزامات کو باطل ثابت کر دیا۔سب حضرات نے منٹو کے افسانوں پر موقع محل کی مناسبت سے تحریر وتقریر کے ذریعے اپنے اپنے نقطہ ہائے نظر منطقی اور ادبی پیرائے میں پیش کیے۔ یہ افسانے جو سرکار کی نظروں میں فحاشی اور عریانی سے لب ریز تھے، جسے وہ فحش اور مخرب الاخلاق قرار دیتے تھے، اور پاک وہند کے اربابِ اقتدار واختیار نے مصنّف کو فحش نگار ثابت کرنے کے لیے حتّی المقدور کوششیں بھی کی تھیں، جب ان پر فحاشی کے الزام میں مقدّمات چلائے گئے ،تو مجموعی طور پر منٹو عدالتوں سے بری قرار پائے۔یعنی اکثریتی فیصلے منٹو کے حق میں ہوئے۔ پانچویں افسانے ''اوپر، نیچے اور درمیان'' میں محض مصنّف کے ہتھیار ڈال دینے کی وجہ سے مجبوراً مجسٹریٹ کو پچیّس روپے جرمانہ کرنا پڑا۔(۳۱) مشرق ومغرب میں اس نوع کے مقدّمات کی متعدّد مثالیں موجود ہیں۔اس میں دل چسپ اور حیرت انگیز امر یہ ہے کہ دونوں جگہوں پر فریقین کے خلاف مقدّمے میں فیصلہ صادر کرتے وقت پوری قطعیت کے ساتھ لفظ ''فحاشی'' کو واضح نہیں کیا جاسکا۔صرف تحریک خیز اور جذبات کو برانگیختہ کرنے والا مواد کو فحش گردانا گیا۔

منٹو کے ان متنازع اور معتوب افسانوں کا غیر جانب دار اور تجزیاتی مطالعہ اِس امر کی جانب واضح اشارہ کرتا ہے کہ ان میں فحاشی کا میلان ہرگز موجود نہیں ہے۔مصنّف نے پوری ذمّے داری کے ساتھ ان افسانوں میں سماجی، نفسیاتی اور جنسی حقیقتوں کی نقاب کُشائی کی ہے،اگر ان افسانوں میں کہیں چند الفاظ، تراکیب یا جملے وغیرہ فحش قسم کے استعمال کیے گئے ہیں،تو انھیں اگر اُن کے مخصوص سیاق وسباق سے علاحدہ کر کے دکھایا جائے تو وہ یقیناً قابلِ گرفت اور معیوب تصوّر کیے جائیں گے۔اُن پر اُنگلی اُٹھائی جاسکتی ہے۔انھیں فحش گردانا جاسکتا ہے، بہ صورتِ دیگر نہیں۔ اِس طرح سے تو مقدّس مقام پر کھڑے واعظین کے وعظ اور بعض مذہبی کُتب بھی اس زمرے میں آجائیں گی۔لہٰذا اس بات کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے کہ تحریروں کے کچھ اپنے فنّی تقاضے ہوتے ہیں۔جن کی پاسداری، علمی اور ادبی نقطۂ نظر سے ازبس ضروری ہے۔اس لیے کسی بھی تحریر کو سمجھنے کے لیے اُسے انفرادیت کے بجائے اجتماعی طور ہی سے دیکھنا ضروری ہوگا۔

بلاشبہ اردو افسانہ نگاری کے پورے دور میں نفسیاتی اور جنسی رجحان کو تقویت ملتی رہی ہے،اگرچہ اس رجحان کی کارفرمائی اردو افسانے کے ابتدائی دور کے رومانی افسانوں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے،لیکن وہاں وہ اِس قدر واضح اور نکھری ہوئی شکل میں موجود نہیں ہے۔ وہ ابتدائی اور انفرادی نقوش تو ضرور ہیں،لیکن رجحان کی صورت اُس نے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی ہی میں اختیار کیا اور افسانہ نگاری کی ایک بڑی کھیپ ذہنی ونفسیاتی پیچیدگیوں اور جنسی مسائل کو افسانے کے مختصر کینوس پر بیان کرنے کے لیے منہمک ہوگئی۔''ترقّی پسند تحریک'' سے قبل ''انگارے'' نامی کتاب کے مصنّفین نے جنسی موضوعات کو اپنے

افسانوں میں جگہ دی۔ بعد ازاں ''ترقّی پسند تحریک'' سے وابستہ افسانہ نگاروں نے جنسی بے راہ روی اور ناروا جنسی آزادی کو مختلف زاویوں سے سماجی پس منظر میں پیش کیا ہے۔نفسیاتی اور جنسی رجحان میں ہمارے بیش تر افسانہ نگاروں پر شعوری اور غیر شعوری طور پر بدیسی ادیبوں کے گہرے اثرات مرتّب ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ فرائڈ، ڈی ایچ لارنس، پروست اور جوائس کے نظریات و افکار اور تعلیمات سے اخذ و استفادہ کیا گیا۔نفسیاتی اور جنسی زاویۂ نظر کے حامل افسانہ نگاروں میں سجّاد ظہیر، احمد علی، حسن عسکری، ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، عزیز احمد، غلام عبّاس، رحمان مذنب، آغا بابر، حسن عسکری، ضمیر الدّین احمد، چودھری محمّد علی ردولوی، خواجہ احمد عبّاس، غلام عبّاس، بلونت سنگھ، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، غلام الثقلین نقوی، جمیلہ ہاشمی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، عصمت چغتائی، ممتاز شیریں، بانو قدسیہ، واجدہ تبسّم وغیرہ شامل ہیں۔ ان ممتاز ادیبوں کا ادب پر بہت بڑا احسان ہے کہ جنھوں نے انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں، جنسی تصوّرات اور جنسی رویّوں کو مختلف زاویوں اور حوالوں سے پیش کر کے دنیاے ادب کو ایک راہ دکھائی۔ اس راستے پر ہمارے یہاں کے متعدّد افسانہ نگار بہت دیر تک بغیر تھکاوٹ کے چلتے رہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے ،تو اردو افسانے کے ان سپوتوں نے اپنی قوّتِ فکر اور مشاہدے و مطالعے سے نفسیاتی اور جنسی تصوّرات و نظریات میں زیادہ وسعت اور معنویت پیدا کر دی تھی، انھوں نے خارجی حالات کے ساتھ ساتھ فرد کی باطنی کائنات میں جھانکنے کی کوششیں کی ہیں۔ اس رجحان کے حامل افسانوں میں پریشان حال افراد کی ذہنی بحالی کے ساتھ اُن کی تشنہ خواہشات اور جذبات و احساسات کو باہر لانے کی مساعی کی گئی ہے۔ انسانی لاشعور کی مختلف گتّھیوں کو سلجھانے کی کوششیں بھی اس دور کے افسانوی ادب میں ملتی ہیں۔ چناں چہ اس رجحان کی وساطت سے بالخصوص قارئین کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ انسان کی نفسیاتی کیفیات اور جنسی حرکات کو کئی حوالوں سے پہچاننے کے قابل ہو گئے۔

ہمارے ادب کی یہ بدقسمتی رہی کہ جہاں شعرا و ادبا نے ذرا بھی بے باکی و جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاشرتی خرابیوں کو صاف گوئی سے پیش کیا۔ وہیں ہر چہار جانب سے اُن کے خلاف طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ باشعور اور ادبی قلم کار بھی ایسے موقعوں پر اپنی آرا کے ذریعے عریانی اور فحاشی ثابت کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ۔ادب میں فحاشی کے بیان کو کوک شاستر کہنا بھی ہمارا عام رویّہ ہے۔ جب کہ فحش لٹریچر اور ادب میں فحاشی اور عریانی کے مسئلے کو الگ الگ کر کے دیکھنا ضروری ہے۔ وارث علوی کے نزدیک جس قسم کا ادب مغرب میں پیدا ہو رہا ہے، اس کے مقابلے میں منٹو اور بیدی، ڈپٹی نذیر احمد کے نواسے معلوم ہوتے ہیں۔[۳۲] ہمارے ہاں بِلا سوچے سمجھے اور عدم واقفیت کی بنا پر اعتراض جڑ دینا یہ بھی ہماری ادبی روایات کا حصّہ رہا ہے اور ایک زمانے میں اس کا خاصا شہرہ بھی تھا۔ الزامات اور اعتراضات کی اس دوڑ میں مدافعین کی بھی کمی نہیں رہی ہے،لیکن بعض مدافعتی پیرائے میں فروگذاشتیں بھی کر بیٹھے اور عریاں نگاری کے بارے میں دنیا کی اعلیٰ اور مقدّس ترین کتابوں کے حوالے دینے سے بھی نہیں چُوکے۔

''میری سمجھ میں آیا کہ دنیا کی اعلیٰ ترین کتابیں بھی کیوں کبھی نہ کبھی عریاں نگاری پر

ضرور آجاتی ہیں۔ قرآن حکیم ہی کی کچھ آیتیں ہیں، جن کا ترجمہ کرنے میں نذیر احمد نے ایک نوٹ لگایا ہے کہ عربی کے لفظ سے عریاں چیز مراد ہے۔ اس لیے انھوں نے دوسرا لفظ استعمال کیا، جو با اخلاق لوگوں میں رائج ہے۔ صحیح بخاری شریف میں بہت سے واقعات لکھے گئے ہیں، جو جدید عریاں نگاروں کے دانت کھٹّے کر دیں۔ ان تمام کتابوں میں جن کو آسمانی اور مذہبی مانا جاتا ہے۔ جیسے بھگوت گیتا، توریت یا انجیل یا زنداوستھا میں ایسے حصّے ضرور ہیں، جن کو عریاں کہا جائے۔ اخلاق جسے شیخ سعدی گلستان کے باب دوم میں ایک حکایت بالکل عریانی کے ساتھ رقم کرتے ہیں۔ حد ہوگئی کہ مولانا روم اپنی اس مثنوی کے پانچویں دفتر میں جس کو ''ہست قرآن در زبان پہلوی'' کہا گیا ہے، کچھ ایسے عریاں قصّے بیان کرتے ہیں، جو تمام عریاں نگاری کو مات کر دیتے ہیں۔''(۳۳)

یہ بات اپنی جگہ درست بلکہ ''سُنّی بہشتی زیور'' اور دیگر مذہبی کتابوں میں بھی حیاتِ انسانی کے بیان میں صاف اور واضح انداز ملتا ہے، لیکن ان سب میں صرف اور صرف مسائلِ انسانی کو بیان کرنا اور آگہی دینا مقصود ہے۔ جب ذکر چل ہی نکلا ہے، تو اس بات کی بھی وضاحت کر دوں کہ قرآن و حدیث میں جو صاف صاف اور عریاں الفاظ پیش بھی کیے گئے ہیں۔ وہ موضوع کی مناسبت سے لائے گئے ہیں۔ پورے سیاق و سباق میں بیان کیے گئے ہیں۔ انھیں انفرادی سطح پر دیکھنا لاعلمی اور عاقبت نااندیشی ہی کہا جائے گا۔ پھر یہ کہ ان مقدّس کتابوں میں ہر جگہ ہدایت، علمِ ادراک اور انسانی مسائل سے آگاہ کرنا اوّلین مطمحِ نظر رہا تھا، تاکہ انسان اپنی ذات، رشتوں ناتوں اور نفوس سے واقفیت حاصل کر سکیں اور اُس کے گمراہ ہونے کے اسباب مسدود ہو سکیں۔ اسی لیے قرآن مجید میں انسان کی تخلیق، آدابِ معاشرت اور مرد و زن کے پاکیزہ تعلّقات کو اصولِ حکمت کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ درحقیقت بنی نوع انسان کا پورا نظامِ حیات اس کتاب میں موجود ہے اور احادیثِ مبارکہ کی کُتب نے ان کی مزید توضیح و تشریح پیش کر دی، تاکہ کم عقل اور نادان انسان حقائقِ فطرت اور قوانینِ قدرت کو جان سکیں۔ اسی بنا پر ربّ العالمین نے انسانی بھلائی سے متعلق سیکڑوں برس قبل، سائنسی ایجادات سے بہت پہلے بہت سی پوشیدہ حقیقتوں کی پردہ کُشائی کر دی۔ اس میں جو چیزیں انسان کے لیے ضرر رساں تھیں، اُن کی ممانعت کر دی گئی اور جو کارآمد و مستحسن تھیں، اُس کا اختیار دے دیا گیا۔ چناں چہ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے تشبیہات کے پیرائے میں واضح انداز میں اپنی اس کتاب میں فرما دیا۔

ترجمہ: ''اب انسان کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اسے کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟ اسے ایک اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔''(۳۴)

ترجمہ: ''اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر پیدا کیا، پھر اس نے نسب اور سسرال کے دو الگ الگ سلسلے چلائے۔''(۳۵)

ترجمہ: ''تمھاری عورتیں تمھاری کھیتیاں ہیں، پس تم اپنی کھیتیوں میں جیسے چاہو آؤ، اور اپنے لیے آئندہ کا کچھ سامان کرلو۔''(۳۶)

یہ انسانی تخلیق کے اسرار، بقائے نسل کے لیے زوجین کا تعلّق اور اسلامی نظامِ معاشرت کے اساسی تصوّرات ہیں۔ اسی طرح قرآن نے کسی جگہ واشگاف الفاظ میں قانونِ زوجیت یا انسانی تعلّق کو بیان بھی کیا ہے، تو اس میں نصیحت، اصلاح اور راستی کا رنگ مضمر ہے۔ کارگاہِ عالم کے اسرار و رموز کو وا کرنا مقصود تھا۔ قرآن کے مطالعے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ وہ بے حیائی، فحاشی اور عریانی کی سخت الفاظ میں مذمّت کرتا اور حجاب و ستر پوشی کی تلقین کرتا ہے۔

ترجمہ: ''اور اے نبی ﷺ، مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں، بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے، اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔(۳۷)

ترجمہ: '' آپ ﷺ فرما دیجیے کہ بلاشبہ میرے رب نے بے حیائی کے کاموں کو ان میں سے جو ظاہر ہوں اور ان میں سے جو پوشیدہ ہوں اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو حرام قرار دیا ہے۔''(۳۸)

بالکل اسی طرح دیگر آسمانی صحیفے و کُتب اور صحاح ستّہ میں بھی ان تصوّرات و خیالات کی گونج سُنائی دیتی ہے، اگر ہمیں صحیح بخاری میں حیض و نفاس اور زوجیت کے معاملات و مسائل کا کُھلم کھلا اظہار دکھائی دیتا ہے، تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس وقت دینِ اسلام کی تکمیل ہو رہی تھی اور آئندہ شرعی احکامات و مسائل کو بتانے کے لیے کسی نبی اور کتاب کو ہرگز ہرگز نہیں آنا تھا۔ لہٰذا خاتم النّبیین ﷺ کے لیے مسائلِ انسانی اور اخلاقیات کی توضیحات و تشریحات کرنا انتہائی ضروری تھا۔ قرآنِ مجید کی طرح احادیث نبوی ﷺ بھی فحاشی اور عریانی کی سخت الفاظ میں مذمّت کرتی نظر آتی ہیں۔

''حضرت انس ؓ سے روایت ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ جس چیز میں فحش ہو (اگرچہ بالفرض جانور یا پتھر میں سہی) وہ اس کو عیب دار کردے گا (تو انسان فحش سے ضرور عیب دار ہوجاوے گا) اور حیا جس چیز میں آجاوے وہ اُس کو عمدہ کردے گی۔''(۳۹)

''حضرت عبداللہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ طعن کرنے والا، کسی پر لعنت بھیجنے والا، فحش گوئی کرنے والا اور بدتمیزی کرنے والا مومن نہیں ہے۔''(۴۰)

قرآن اور احادیث میں جنسی مسائل پر گفتگو کی نوعیت علمی، قانونی اور فقہی ہے۔ اس لیے بعض اوقات ان چیزوں کی وضاحت لازمی ہوجاتی ہے اور یہ عریانی وفحش کی تعریف میں نہیں آتیں۔علاوہ ازیں بعض ادبی تصوّرات کو بلا جواز مذہبی کتابوں سے جوڑنا، استنباط کرنا یا غلط مثالیں قائم کرنا بھی کوئی مستحسن عمل نہیں ہے۔ راقم نے محض اُن منفی تصوّرات کو زائل کرنے کے لیے مختصراً حقائق بیانی کی کوشش کی ہے۔ یاد رہے کہ ادب اپنا ایک مکمّل الگ وجود رکھتا ہے۔وہ ان مقدّس کتابوں کی نسبت بہت سی پابندیوں سے مبرّا و ماورا ہے۔ دنیا جہاں کے موضوعات کو وہ اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ ادب کے ذریعے ہمارے جسم وروح کو فرحت وتازگی اور سکون وانبساط پہنچانے کے لیے ادبا برس ہا برس سے تخلیقی عمل میں مصروف ہیں۔ مصروفیت کے اس عمل کے دوران وہ کبھی کبھار، دانستہ وغیر دانستہ سماجی لحاظ سے ایسی باتیں بھی رقم کر گئے، جنھیں کبھی عریاں گردانا گیا تو کبھی اُسے فحش قرار دیا گیا،لیکن الزامات اور تہمات کو خاطر میں لائے گئے وہ ایک فرض کی طرح دل کش اور حسین ادب کی تخلیق میں منہمک رہے۔

انّیس ویں صدی کی نسبت بیس ویں صدی میں تہذیبوں کی اکھاڑ پچھاڑ اور انسانی تصوّرات ونظریات میں غیر معمولی تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔آزاد خیالی اور اخلاقی انحطاط نے عریانی اور فحاشی کو پروان چڑھانے میں معتد بہ اضافہ کیا۔ عریاں پن میں مغربی تصوّرات سب سے زیادہ بلند رہے۔سماجی حلقوں اور حکومتی سطح پر عریانیت کی حمایت اور ہمّت افزائی کی گئی۔اس بات کی تصدیق اُن کے مخصوص برہنہ سواحل کرتے ہیں۔ جہاں مرد وزن کو صرف اور صرف بے لباسی ہی کی صورت میں جانے کی اجازت ہوتی ہے۔اس کے علاوہ فطرت پسندی کے بعض اور بھی مقامات؛ رقص گاہیں اور کلب وغیرہ ہیں، جہاں ستر کشائی اور اعضاے جنسی کی طرف سماجی رویّہ ہمدردانہ رہا ہے۔مخصوص مقامات کے علاوہ اُن کا معاشرہ تہواروں اور عوامی مقامات پر عریانیت کو برداشت یا قبول کر لیتے ہیں۔مغرب اور یورپ کی تیز رفتار صنعتی ترقّی کے ساتھ سماجی زندگی میں بھی نمایاں ترقّی دیکھنے میں آئی ہے۔تعلیمی نصاب میں علمِ جنسیات کو شامل کر لینا ہمارے لیے اچنبھے کی بات ہوسکتی ہے،لیکن اُن کے ہاں ہرگز نہیں۔ وہاں یہ عالَم ہے کہ والدین اپنے بچّوں کو بواے فرینڈ اور گرل فرینڈ بنانے کی ترغیب دیتے نظر آتے ہیں۔ اسی لیے اُن کے سماج میں مرد وعورت کا شادی سے قبل گھومنا پھرنا اور جنسی میل جول رکھنا کوئی معیوب کُن بات نہیں، سرِ راہ یا دورانِ سفر بغل گیر ہونا یا بوس وکنار کرنا کوئی عجیب بات نہیں۔ڈاکٹر احسن فاروقی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ یورپ کی عورتیں بسوں میں مردوں کی گود میں بیٹھ جاتی ہیں اور اکثر ہوٹلوں میں انجان مرد وزن ایک ساتھ ایک ہی بستر پر سو بھی جاتے ہیں اور صبح کو بالکل انجان بن کر چل پڑتے ہیں۔[۴۱] جب کہ ہمارے معاشرتی نظام میں ان حرکات وافعال کو کسی بھی طرح فحاشی سے کم تر نہیں گردانا جائے گا۔ کیوں کہ اُن سے بہت کچھ قبول کرنے کے باوجود بھی ہم نے بہت سی اپنی خاندانی، مذہبی اور اخلاقی اقدار وروایات کو مضبوطی سے تھامے رکھا ہوا ہے، جو اس تفاوت کو برقرار رکھنے میں بخوبی اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

اِس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں ہے کہ مغرب اور یورپ میں اخلاق واقدار کا کوئی واضح اور باضابطہ تصوّر موجود نہیں

ہے،اخلاقیات ان کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں،لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اُن پر گرد کی دبیز تہیں پڑ چکی ہیں۔نیز اخلاقی تصوّرات میں بھی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں،جس کی وجہ سے عصرِ حاضر میں اب ان کا اخلاقی نظام غیر مؤثّر اور غیر فعال ہو کر تباہ و برباد ہو چکا ہے، اور اس وقت وہ اخلاقی اعتبار سے تباہی کے دہانے پر ہیں۔سائنس اور ٹیکنالوجی میں اگر ان کے ہاں برتری ہے تو اخلاقی اعتبار سے ابتری ہے، ترقّی کے ساتھ تنزّل موجود ہے اور اِس حقیقت کو انھوں نے بھی جان لیا ہے۔اہلِ دانش گہری تشویش میں مبتلا ہونے کے باوجود بھی اس کے سدِّ باب سے قاصر ہیں۔

فحاشی اور عریانی سے متعلّق کوئی بھی حتمی رائے قائم کرتے وقت حالات وواقعات کو مدِّنظر رکھنا انتہائی ضروری امر ہے۔بعض اوقات کسی واقعے یا تحریری مواد کا ان تصوّرات سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا،لیکن ہمارے اخلاق اور نام نہاد علم بردارانِ ادب عریانی اور فحاشی کا فتوٰی جاری کر دیتے ہیں۔تخلیق سے چند جملے اور چند الفاظ نوچ کر اُسے عریاں اور فحش قرار دیتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ بعض اوقات کوئی عریاں حقیقت بھی عریانی کے زُمرے میں نہیں آتی۔مثال کے طور پر ایک ڈاکٹر مریضہ کا آپریشن کرنے سے قبل اُس کی بیماری سے متعلّق اُس سے بالکل صاف صاف،کُرید کُرید کر عریاں سوالات کرتا ہے اور پھر نسوانی امراض میں یا دیگر آپریشن میں ڈاکٹر کے سامنے مریض یا مریضہ تقریباً عریاں حالت میں ہوتے ہیں۔ مختلف ایکسرے اور الٹراساؤنڈ کراتے وقت بھی تقریباً یہی کیفیت ہوتی ہے،لیکن یہ کسی صورت میں عریانیت نہیں ہے۔کیوں کہ درحقیقت عریانی کا تعلّق دل و دماغ سے ہوتا ہے۔ان کیفیات سے گزرتے وقت انسان کا ذہن ان خیالات سے منزّہ ہوتا ہے۔ زیادتی کے مقدّمات میں بھی عدالتی کمروں میں وکلا طرفین سے ہر نوع کے عریاں سوالات کرتے نظر آتے ہیں۔اسی طرح غسل کے لمحات میں بھی انسان بے لباس ہوتا ہے۔حوائجِ ضروریہ کے وقت بھی کم وبیش ان ہی کیفیات سے انسان گزرتا ہے۔ چوں کہ اخلاقی، قانونی اور مذہبی سطح پر یہ جائز ضرورتیں ہیں، اس لیے یہ عریانی کے زمرے میں نہیں آتیں،لیکن ہمارے سماجی ماحول میں جب یہ غسل کا عمل حدود و قیود کو توڑ کر جھیل، دریا، آبشار، ساحل پر محض اشتعال انگیزی کے لیے کیا جائے،تو ایسے فعل کو برہنگی ہی کہا جائے گا۔اسی طرح مضافات سے آئی ہوئی خواتین جب شہروں میں وارد ہوتی ہیں تو بسوں، ویگنوں اور بازاروں میں اپنے شیر خوار بچّوں کو اپنی چھاتیوں سے دودھ پلا رہی ہوتی ہیں۔ بادی النظر میں اُن کا یہ فطری عمل عریاں نہیں ہوسکتا،اور وہ اسے عریاں بھی نہیں سمجھتیں، البتّہ بیمار ذہن اس منظر سے لذّت حاصل کرسکتا ہے۔اسی طرح اسپتال کے ایکسرے، الٹراساؤنڈ اور آپریشن روم میں عریاں حالت میں موجود عورت کو دیکھ کر باہر سے آیا بیمار ذہن کا مالک جنسی حظ اُٹھا سکتا ہے۔ جہاں تک جنسی تسکین کی بات ہے،تو ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے، جو انتہائی قریبی عزیز ہوتے ہوئے بچیوں سے خوشی وغمی کے موقع پر مصافحہ ومعانقہ کرتے وقت جنسی تسکین حاصل کر لیتے ہیں۔حد تو یہ ہے کہ اس طرح کے لوگ مذہبی کتابوں میں درج حیض ونفاس،تخلیقِ انسان، زوجی قوانین اور مباشرت کے معاملات ومسائل سے بھی جنسی لطف اُٹھا لیتے ہیں۔ جب کہ دوسری جانب عریاں فلموں میں جنسی آسنوں کے عریاں مناظر بھی مثبت فکر کے حامل افراد کے لیے جنسی

تحریک پیدا کرنے کے بجائے ازدواجی زندگی میں استفادے کا موجب بنتے ہیں۔ اسی طرح جنسی مواد بھی بہت سی مشکل اور مبہم باتوں کو آسان اور واضح کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔

زمانی تفاوت نے بھی عریانی اور فحاشی کے تصوّرات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ آج سے تیس پینتیس برس قبل تک کنبے میں وی سی آر پر فلم دیکھتے وقت کسی عریاں گیت یا منظر کو دیکھ کر فوراً اُسے آگے کر دیا جاتا یا پھر بند کر دیا کرتے تھے، لیکن اب قطعاً اس کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ اُس دور کی تھوڑی سی احتیاط اور پردگی کبھی کبھار تجسّس کو مزید ہوا دینے کی موجب بھی بنتی تھی۔ اسی طرح ایک زمانے تک شادی شدہ جوڑے کا خاندان میں دن کے اُجالے میں گفت وشنید کرنا، پاس بیٹھنا، کھانا کھانا، نام لینا، اپنے ہی بچّے کو گود میں لینا وغیرہ تک انتہائی معیوب سمجھا جاتا تھا اور بھولے سے ان میں سے کوئی فعل سرزد ہوجائے تو اُسے بے حیائی تصوّر کیا جاتا تھا۔ عورت کا بناؤ سنگھار کر کے بے پردہ گھومنا، ملازمت کرنا بھی اگلے وقتوں کے لوگوں کے نزدیک غیر اخلاقی اور فحش جانا جاتا تھا، جب کہ عصرِ حاضر کی بعض خواتین مثلاً ٹی وی فلم کی اداکارائیں، ٹیلی وژن کی اینکر، شاعرات وغیرہ مردوں سے بے باکانہ انداز کے ساتھ محافل میں مصافحہ اور معانقہ تک کرتی نظر آتی ہیں۔ مخلوط تعلیمی نظام کو دیہات میں اب بھی برا جانا جاتا ہے۔ دیہات میں جہاں مخلوط تعلیمی نظام بہ حالتِ مجبوری جاری و ساری ہے، وہاں ایک ہی کلاس میں طلبہ وطالبات کے درمیان بے پردگی سے بچاؤ کے لیے ایک پردہ لٹکا دیا جاتا ہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات نے آج ماضی کے ان تصوّرات پر گرد کی اِس قدر تہیں جما دی ہیں کہ نئی پود کو اس کا یقین دلانا بھی ایک مشکل کام ہے۔

اب جب کہ اکّیس ویں صدی کی دوسری دہائی بھی اختتام پذیر ہوگئی ہے اور سوشل میڈیا کی یلغار نے ہماری نوجوان نسل کی آنکھوں سے سب پردے ہٹا دیے ہیں، نئی پود کی دست رس میں اس پانچ چھے انچ موبائل کی جدید ٹیکنالوجی نے اگر انھیں علمی معلومات اور نت نئی اطلاعات سے مالا مال کیا ہے، تو دوسری جانب اخلاقی اقدار کو تہس نہس بھی کر دیا ہے۔ انٹرنیٹ فحاشی اور عریانی کا سب سے بڑا اور سہل الحصول منبع ہے، جس سے مثبت معاملات قدرے کم، جب کہ منفی رجحانات بڑی تیزی سے فروغ پا رہے ہیں۔ نئی نسل بڑی سُرعت کے ساتھ ہر نوع کی معلومات ان ذرائع سے کشید کر رہی ہے۔ گذشتہ صدی کا شخص جن جنسی اسرار ورموز سے بہ مشکل کبرسنی میں واقف ہوتا تھا، اِس صدی کا فرد اِن سے بہ آسانی کم سنی یعنی میٹرک ہی میں کامل واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے باوجود دورِ حاضر میں اِن سے اخفا اور پردہ پوشی کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ اِن پر عدم اعتماد کرتے ہوئے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کی سطح پر کچھ ''سمجھ دار'' اساتذۂ کرام بعض اشعار کی تفہیم میں عشقِ مجاز کو عشقِ حقیقی سے بدل دیتے ہیں۔ اِس سے بڑھ کر کالجز اور جامعات کی نصابی کتب کے اسباق میں مرتّبین نے بعض اسباق کو اپنے تئیں کانٹ چھانٹ کر کے انھیں منزّہ ومطہّر کر دیا ہے۔ اِس قطع وبرید اور ترامیم کو سندھ ٹیکسٹ بُک بورڈ کی بارھویں جماعت کی ''گلزارِ اردو'' میں سعادت حسن منٹو کا افسانہ ''نیا قانون'' اور غلام عبّاس کا ''مجسّمہ'' وغیرہ میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ ان تخلیقات سے نوچ کر نکال دیے جانے والے الفاظ وتراکیب شاید معلّمینِ اخلاق کی نظر میں فحاشی اور عریانی کے

زمرے میں آتے ہوں گے۔ مرتّبین، مؤلّفین اور مدرّسین کے حزم واحتیاط اور خوف سے بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ابھی ہماری سماجی صورتِ حال کے پیشِ نظر اردو ادب میں جس فراخ دلی اور مستقبل کے معماروں پر اعتبار کی فضا کو پروان چڑھانا تھا، وہ اب بھی اِس سے کوسوں دور ہے!!

اردو ادب میں فحاشی اور عریانی کے اِس جائزے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مختلف اصنافِ ادب میں اِس کی کارفرمائی رہی ہے اور ہر عہد میں اس کے تصوّرات کچھ فرق کے ساتھ موجود رہے ہیں۔ تخلیقات کی پیش کش میں شعرا وادبا کا زاویۂ نظر بھی عہدِ قدیم سے عہدِ جدید تک تبدیل ہوتا رہا ہے۔ مندروں، تہواروں، رسم ورواج، فنونِ لطیفہ اور شعروادب میں اس کے آثار ملتے ہیں۔ فلمیں، تصاویر، فحش میگزین، نائٹس کلب وغیرہ کی یلغار نے اس تبدیلی میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ اخلاقی قدروں اور زمان ومکاں میں تغیّر وتبدّل سے ان تصوّرات میں تبدیلیاں آگئی ہیں۔ عہدِ حاضر میں جدید مغربی علوم وفنون، سائنس اور ٹیکنالوجی اور سوشل میڈیا کے انکشافات نے سماجی بیداری میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ لہٰذا اب ضرورت اس امر کی ہے کہ تحریر وتقریر میں فحاشی اور عریانی پر کوئی فیصلہ صادر کرتے وقت عصرِ حاضر کی سماجی صورتِ حال کو بھی ملحوظِ خاطر رکھ لیا جائے۔

حواشی:

(۱) سیّد محمد علی خاں، تفضل حسین خان (حیدرآباد دکن: فیض الکریم پریس، ۱۳۳۹ھ)، ص ۶۔

(۱) شہزاد منظر، فحش نگاری ایک اضافی تصوّر، مشمولہ: طلوعِ افکار، کراچی، شمارہ ۳۷، جنوری ۱۹۷۶ء، ص ۲۵۔

(۲) ہدایت اللہ اور دیگر مرتّبین، اردو جامع انسائیکلو پیڈیا، جلد دوم، مدیرِ اعلیٰ: مولانا حامد علی خاں (لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز پرائیویٹ لمیٹڈ)، اشاعتِ اوّل، جلد دوم: ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۶۰۔

(۳) نیاز فتح پوری، ترغیباتِ جنسی یا شہوانیات (لاہور، آواز اشاعت گھر)، س ن، ص ۱۰۔

(۴) فرمان فتح پوری، مدیرِ اعلیٰ، اردو لغت، جلد سیز دہم، اردو لغت بورڈ (کراچی، ترقّی اردو بورڈ)، جون ۱۹۹۱ء، ص ۸۵۱۔ اور وارث سرہندی (مرتّبہ)، ''علمی اردو لغت'' (لاہور، علمی کتب خانہ)، ۱۹۷۶ء، ص ۱۰۴۷۔

(۵) سعادت حسن منٹو، لذّتِ سنگ (مقدّمہ)، مشمولہ: لذّتِ سنگ (دہلی، ساقی بک ڈپو)، س ن، ص ۴۰۔

(۶) محمد حسن عسکری، جھلکیاں، حصّہ اوّل، مرتّبہ: سہیل عمر، نعمانہ عمر (لاہور، مکتبہ الروایت)، سن ندارد، ص ۱۵۔

(۷) سعادت حسن منٹو، زحمتِ مہرِ درخشاں، مشمولہ: ٹھنڈا گوشت (لاہور، مکتبۂ جدید)، س ن، ص ۳۴۔۳۵۔

(۸) سلیم اختر، ادب اور فحاشی، مشمولہ: سیپ، کراچی، شمارہ ۱۴، مدیر: نسیم درّانی، دسمبر ۱۹۶۸ء، ص ۴۳۔

(۹) اردو لغت، جلد سیز دہم، اردو لغت بورڈ، مدیرِ اعلیٰ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری (کراچی، ترقّی اردو بورڈ)، جون ۱۹۹۱ء، ص ۳۸۶۔

(۱۰) ابوالاعجاز حفیظ صدّیقی (مرتبہ)، کشّاف تنقیدی اصطلاحات (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان)، طبع دوم: ستمبر ۱۹۸۵ء،

ص ۱۲۲۔ ۱۲۳۔

(۱۱) نیاز فتح پوری، محوّلہ بالا، ص ۳۶۔

(۱۲) شورش کاشمیری، اُس بازار میں (لاہور، مطبوعاتِ چٹان)، مئی ۱۹۹۴ء، ص ۱۶۹۔

(۱۳) محمود نظامی، اردو شاعری میں جنسی احساس کی نشوونما، ساقی دہلی، اپریل ۱۹۴۴ء، جلد ۲۹، نمبر ۴، ص ۱۷۔

(۱۴) میر تقی میر، کلیاتِ میر، دیوان چہارم، مرتّب: ڈاکٹر عبادت بریلوی (کراچی، اردو دنیا)، فروری ۱۹۵۸ء، ص ۷۰۸۔

(۱۵) ایضًا، دیوانِ اوّل، ص ۳۳۴۔

(۱۶) ایضًا، دیوانِ دوم، ص ۴۹۱۔

(۱۷) ایضًا، ص ۴۴۹۔

(۱۸) قاضی محمد اختر جونا گڑھی، اردو شاعری میں جنس نگاری، مشمولہ: طلوعِ افکار (ادب وجنس نمبر)، مدیر: حسین انجم، رضویہ کالونی، کراچی، دسمبر ۱۹۷۵ء، ص ۱۳۹۔

(۱۹) انشاء اللہ خان، کلیات انشاء اللہ خان (انڈیا، مطبع نامی منشی نول کشور)، سن، ص ۱۸۹-۱۹۶۔

(۲۰) شوق لکھنوی، زہرِ عشق، جوابِ خط، ترتیب وتقدیم: عاشق کیرانوی (کراچی، غالب اکیڈمی)، بارِ اوّل: ۱۹۶۹ء، ص ۶۷، ۶۹۔

(۲۱) ایضاً، آخری التماس، ص ۱۰۳۔۱۰۸۔

(۲۲) حکیم مومن خان صاحب دہلوی، کلیاتِ مومن (لاہور، مکتبۂ شعروادب)، ۱۹۹۱ء، ص ۳۰۵۔

(۲۳) میر غلام حسن حسنؔ دہلوی، مثنوی سحر البیان (داستان دوبارہ بے نظیر کے آنے اور باہم بے تکلّف ملاقات کرنے کی)، مدوّن: رشید حسن خاں، (لاہور، مجلسِ ترقّیٔ ادب)، اشاعتِ اوّل: مئی ۲۰۰۹ء، ص ۲۱۱۔۲۱۲۔

(۲۴) فہمیدہ ریاض، میں مٹّی کی مورت ہوں (لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز)، ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۸۔۱۳۹۔

(۲۵) سید احتشام حسین، ذوقِ ادب اور لاشعور (لکھنؤ، ادارۂ فروغِ اردو)، ۱۹۵۵ء، ص ۷۸۔۷۹۔

(۲۶) ثاقب رزمی، ترقّی پسند نظریۂ ادب کی تشکیلِ جدید (لاہور، آئینۂ ادب چوک)، ۱۹۸۷ء، ص ۱۱۰۔

(۲۷) سجاد ظہیر، روشنائی (کراچی، مکتبۂ دانیال)، اکتوبر ۱۹۷۶ء، ص ۳۶۹۔۳۷۰۔

(۲۸) خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقّی پسند ادبی تحریک (علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس)، ۲۰۰۲ء، ص ۸۴۔

(۲۹) عصمت چغتائی، شہرت نہیں بدنامی کہیے، مشمولہ: روشنی کم، تپش زیادہ، ترتیب وتدوین: علی اقبال (کراچی، رائل بک کمپنی)، اشاعتِ اوّل: ۲۰۱۱ء، ص ۵۰۸۔

(۳۰) ہندوستان اور پاکستان میں منٹو کے پانچ افسانوں پر فحاشی کے الزام میں مقدّمات قائم کیے گئے۔ ہندوستان میں زیرِ دفعہ ۲۹۲ تعزیراتِ ہند کے تحت تین افسانوں: ''کالی شلوار''، ''دھواں'' اور ''بُو'' پر مقدّمے چلائے گئے۔ جب کہ اسی دفعہ (تعزیراتِ ہند کے بجائے تعزیراتِ پاکستان) کے تحت پاکستان میں دو افسانوں: ''ٹھنڈا گوشت'' اور ''اوپر نیچے اور درمیان'' پر مقدّمات بنائے گئے۔

(۳۱) سعادت حسن منٹو، دستاویز، (لاہور، مکتبۂ شعروادب) س ن، ص ۱۸۲۔

(۳۲) وارث علوی، فکشن کی تنقید کا المیہ (کراچی، سٹی پریس بک شاپ)، پہلی اشاعت: ۲۰۰۰ء، ص ۸۰

(۳۳) محمد احسن فاروقی ''ادب میں عریانی کا سوال''، مشمولہ: سیپ، کراچی، شمارہ ۱۴، مدیر: نسیم درّانی، دسمبر ۱۹۶۸ء، ص ۳۷۔

(۳۴) مترجم: مفتی تقی عثمانی، قرآنِ مجید، سورۃ الطّارق، آیت نمبر: ۶، ۵، (سافٹ ویر: اسلام ۳۶۰)۔

(۳۵) ایضًا، مترجم: ابوالاعلیٰ مودودی، سورۃ الفرقان، آیت نمبر ۵۴۔
(۳۶) ایضًا، مترجم: طاہر القادری، سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۲۲۳۔
(۳۷) ایضًا، مترجم: ابوالاعلیٰ مودودی، سورۃ النّور، آیت ۳۱۔
(۳۸) ایضًا، مترجم: مفتی محمّد نعیم، سورۃ الاعراف، آیت نمبر: ۳۳۔
(۳۹) حضرت علاّمہ وحیدالزّماں، مترجم، سنن ابنِ ماجہ شریف، جلد سوم (لاہور، اسلامی اکادمی)، جنوری ۱۹۹۰ء، ص ۵۴۱۔
(۴۰) مولانا فضل احمد، مترجم، جامع ترمذی، جلد اوّل (کراچی، دارالاشاعت)، س ن، ص ۶۵۲۔
(۴۱) محمد احسن فاروقی، ادب میں عریانی کا سوال، مشمولہ: سیپ، کراچی، شمارہ ۱۴، محوّلہ بالا، ص ۳۹۔

مآخذ:

(۱) احمد، مولانا ڈاکٹر فضل، مترجم، جامع ترمذی، جلد اوّل (کراچی، دارالاشاعت)، س ن۔
(۳) اعظمی، خلیل الرحمٰن، اردو میں ترقّی پسند ادبی تحریک (علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس)، ۲۰۰۲ء۔
(۵) چغتائی، عصمت، شہرت نہیں بدنامی کہیے، مشمولہ: روشنی کم، تپش زیادہ، ترتیب وتدوین: علی اقبال (کراچی، رائل بک کمپنی)، اشاعتِ اوّل: ۲۰۱۱ء۔
(۶) حسین، سید احتشام، ذوقِ ادب اور لاشعور (لکھنؤ، ادارۂ فروغِ اردو)، ۱۹۵۵ء۔
(۷) خان، انشاء اللہ، کلیاتِ انشاء اللہ خان (انڈیا، مطبع نامی منشی نول کشور)، س ن۔
(۸) دہلوی، حکیم مومن خان صاحب، کلیاتِ مومن (لاہور، مکتبۂ شعروادب)، ۱۹۹۱ء۔
(۹) دہلوی، میر غلام حسن حسنؔ، مثنوی سحر البیان، مدوّن: رشید حسن خاں، (لاہور، مجلسِ ترقّیٔ ادب)، اشاعتِ اوّل: مئی ۲۰۰۹ء۔
(۱۰) رزمی، ثاقب، ترقّی پسند نظریۂ ادب کی تشکیلِ جدید (لاہور، آئینۂ ادب چوک)، ۱۹۸۷ء۔
(۱۱) ریاض، فہمیدہ، میں مٹّی کی مورت ہوں (لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز)، ۱۹۸۸ء۔
(۱۲) سرہندی، وارث (مرتّبہ)، ''علمی اردو لغت'' (لاہور، علمی کتب خانہ)، ۱۹۷۶ء۔
(۱۳) صدّیقی، ابوالاعجاز حفیظ (مرتبہ)، کشّاف تنقیدی اصطلاحات (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان)، طبع دوم: ستمبر ۱۹۸۵ء۔
(۱۴) ظہیر، سجّاد، روشنائی (کراچی، مکتبۂ دانیال)، اکتوبر ۱۹۷۶ء۔
(۱۵) عسکری، محمّد حسن، جھلکیاں، حصّۂ اوّل، مرتّبہ: سہیل عمر، نعمانہ عمر (لاہور، مکتبہ الرّوایت)، سنہ ندارد۔
(۱۶) علوی، وارث، فکشن کی تنقید کا المیہ (کراچی، سٹی پریس بک شاپ)، پہلی اشاعت: ۲۰۰۰۔
(۱۸) فتح پوری، فرمان، مدیرِ اعلیٰ، اردو لغت، جلد سیز دہم، اردو لغت بورڈ (کراچی، ترقّی اردو بورڈ)، جون ۱۹۹۱ء۔
(۱۹) فتح پوری، نیاز، ترغیباتِ جنسی یا شہوانیات (لاہور، آواز اشاعت گھر)، س ن۔
(۲۰) کاشمیری، شورش، اُس بازار میں (لاہور، مطبوعاتِ چٹان)، مئی ۱۹۹۴ء۔
(۲۱) لکھنوی، شوق، زہرِ عشق (جوابِ خط)، ترتیب وتقدیم: عاشق کیرانوی (کراچی، غالب اکیڈمی)، بارِ اوّل: ۱۹۶۹ء۔
(۲۲) منٹو، سعادت حسن، دستاویز، (لاہور، مکتبۂ شعروادب) س ن۔

(۲۳) منٹو، سعادت حسن، زحمتِ مہرِ درخشاں، مشمولہ: ٹھنڈا گوشت (لاہور، مکتبۂ جدید)، س ن۔
(۲۴) منٹو، سعادت حسن، لذّتِ سنگ (مقدّمہ)، مشمولہ: لذّتِ سنگ (دہلی، ساقی بُک ڈپو)، س ن۔
(۲۶) مودودی، ابوالاعلیٰ و دیگر (مترجمین)، قرآنِ مجید [سافٹ ویر: اسلام ۳۶۰]۔
(۲۷) میر، میر تقی، کلیاتِ میر، دیوانِ اوّل، دوم، چہارم، مرتّب: ڈاکٹر عبادت بریلوی (کراچی، اردو دنیا)، فروری ۱۹۵۸ء۔
(۲۹) وحید الزّماں، حضرت علاّمہ، مترجم، سنن ابنِ ماجہ شریف، جلد سوم (لاہور، اسلامی اکادمی)، جنوری ۱۹۹۰ء۔
(۳۰) ہدایت اللہ اور دیگر مرتّبین، اردو جامع انسائیکلوپیڈیا، جلد دوم، مدیرِ اعلیٰ: مولانا حامد علی خاں، شیخ غلام علی اینڈ سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، اشاعتِ اوّل، جلد دوم: ۱۹۸۸ء۔

رسائل:

(۲) سیپ، کراچی، شمارہ ۱۴، مدیر: نسیم درّانی، دسمبر ۱۹۶۸ء
(۴) طلوعِ افکار (ادب و جنس نمبر)، مدیر: حسین انجم، رضویہ کالونی، کراچی، دسمبر ۱۹۷۵ء
(۲۵) _____، شمارہ ۷۳، جنوری ۱۹۷۶ء
(۲۸) ساقی، دہلی، اپریل ۱۹۴۴ء، جلد ۲۹، نمبر ۴